رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۳۰

جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

March 1958

جلد ۴۹ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۹ | جمادی الآخری ۱۳۷۷ھ مطابق مارچ ۱۹۵۸ء | عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے
شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکمت سید مودودی رح

[redacted]

ہمارے اس عہد کا کونسا ایسا شخص ہے جو علوم طبیعی کے انکشافات اور کمالات اور اُن کے اثرات سے ناواقف ہو۔ ہر انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ان ایجادات نے انسان کے مادی آرام و آسائش میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ طریقۂ پیدائش میں نئی نئی گرہیں کھلنے سے انسان کو فراوانی میسر آئی ہے۔ سمندر کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرّات کو اپنے نامہ و پیام کا ایلچی بنانے اور خودبخود بجنے والے باجوں اور ہوش ربا سرعت سے چلنے والی سواریوں کے کرشموں نے انسانی زندگی کو بے حد قوت عطا کی ہے اور اسی کی مدد سے اُس نے حیرت انگیز کام سرانجام دیئے ہیں۔

سائنس کی ان ایجادات کے اثرات صرف مادی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ ان سے انسان کی حیاتِ اجتماعی بھی شدید طور پر متاثر ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں نظام اسلامی برپا کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ حالات کے ان غیر معمولی تغیرات کو پوری طرح ذہن میں رکھ کر اقدام کریں۔ ان صفحات میں یہ ممکن نہیں کہ ہم ان سارے تغیرات کا تفصیلی جائزہ لیں۔ یہاں ہم صرف چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

دورِ جدید کے انسان کے لیے نتائج کے اعتبار سے سب سے اہم ایجاد بھاپ کے دیو کی تسخیر ہے۔ اُس نے جس روز سے اس سے کام لینا شروع کیا ہے، اُسی دن سے اُس کے سامنے لاتعداد مسائل پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کثیر پیداواری اور زر پیداواری نے، جو اس دیو کی خدمت کے بالکل قدرتی نتائج ہیں، دُنیا میں بے روزگاری، استعماریت، خون ریزی، سفاکی، بے حسی اور طبقاتی تقسیم کو جنم دیا۔ برق آسا ذرائع رسل و رسائل نے زمان و مکان کی حد بندیاں دور کر کے پوری دنیا کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بنا دیا ہے۔ اب نہ صرف کرۂ ارضی کے دُور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں،

بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبے بھی ایک دوسرے میں اس طرح تحلیل ہو گئے ہیں کہ ہم ان کے درمیان کوئی حدِ امتیاز نہیں کھینچ سکتے۔ حیاتِ انسانی میں یہ اتنا عظیم تغیر ہے کہ اس نے زندگی کے سارے پہلوؤں پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

آپ اگر صنعتی انقلاب سے پہلے کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حیاتِ انسانی مختلف اکائیوں میں بکھری پڑی تھی۔ ان اکائیوں میں ممکن ہے بہت سی چیزیں مشترک بھی ہوں اور وقت کے تہذیبی اثرات کی پرچھائیں بھی پڑتی ہوں لیکن ان مختلف اکائیوں میں رہنے والے لوگ نہ تو فکر و نظر کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے کے ہم آہنگ تھے اور نہ تمدن و معاشرت میں ہم رنگ۔ لیکن جس دن سے ذرائعِ رسل و رسائل نے دنیا کے مختلف حصوں کی طنابیں کھینچ کر انھیں ایک دوسرے کے بالکل نزدیک کر دیا ہے، اسی دن سے انسان کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی قدار کو غالب قوتوں کی دست برد سے بچا کر رکھے۔ یہ قوتیں سیلِ بے پناہ کی طرح جب امڈ پڑتی ہیں تو پھر کوئی جگہ ان کی زد سے محفوظ نہیں رہتی۔ گھر، بازار، دربار و ایوان، ثقافتی اور معاشرتی ادارے __ الغرض زندگی کے سارے شعبے اس کی لپیٹ میں یکساں طور پر آجاتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہتا جو ہزار سعی کے باوجود اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کر دے۔ چنانچہ وہ قومیں جن کے ہاں رنگ و نسل کا امتیاز دین و ایمان کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا ہے، وہ بھی فکر و نظر کی کسی اساسی تبدیلی کے بغیر محض حالات کے ہاتھوں اسے ترک کر دینے پر مجبور ہوئی ہیں۔ یہی حال آداب و اطوار، آرائش و زیبائش اور طرزِ بود و ماند کا ہے۔ زندگی کے جن طور طریقوں کو عروج حاصل ہوتا ہے وہ بڑی ہی سرعت کے ساتھ دوسرے لوگوں میں پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو ان کی راہ روک سکے۔

اسی طرح معاشی میدان میں بھی ایک زبردست تغیر رونما ہوا ہے۔ ذرائع آمد و رفت نے صرف دنیا کے مختلف ممالک کو ہی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملا دیا، بلکہ ہر شہر اور ہر قریہ کو پوری دنیا کے ساتھ

اس طرح جوڑ دیا ہے کہ اب اُس کا کسی طرح بھی اُس سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں رہا۔ اس تبدیلی کے بعد اب اگر کوئی قوم یہ سمجھتی ہے کہ وہ کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر وقت کے بُرے اثرات سے اپنے آپ کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ جنت الحمقا میں بستی ہے۔ ایک ملک خواہ اپنے لیے کسی نظامِ معیشت کو پسند کرے لیکن وہ اس بات کے لیے بالکل مجبور ہوتا ہے کہ وقت کے معاشی تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ وہ اپنے دلپسند نظامِ معیشت کو اس وقت تک اپنا نہیں سکتا جب تک کہ اس کے پاس ساری دنیا سے لڑ جانے کی طاقت پیدا نہ کرے اور بالآخر دنیا کے رجحانات کو بدل کر اسے دنیا کی ایک غالب قوت بنا کر نہ رکھ دے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں اگر کوئی اللہ کا بندہ رزقِ حلال کا لقمہ مُنہ میں ڈالنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو اُس کو پوری دنیا کے ساتھ جنگ آزما ہونا پڑے گا۔

حالات اور فکر و نظر کی اسی تبدیلی کے نتیجہ میں اب دنیا کی ساری حکومتوں نے عدمِ مداخلت (LAIZZEZ FAIRE) کی پالیسی کو ترک کر کے معاشی میدان میں پوری طرح دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ اس دور میں کوئی حکومت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ معیشت کے معاملہ میں ایک خاموش اور بے تعلق تماشائی بن کر بیٹھی رہے اور اگر وہ ایسا کرنے کی حماقت کرے گی تو خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود دے گی۔ چنانچہ دیکھیے کہ اب ہر حکومت درآمد و برآمد پر پورا پورا کنٹرول رکھتی ہے، کارخانوں کی ترقی و توسیع میں، پیداوار کو بڑھانے اور گھٹانے میں اسے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ملک کی ساری معیشت پر اُس کا پوری طرح قبضہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہتی ہے اسے نشو و نما دیتی ہے اور جن سانچوں میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ اور اگر وہ اس کا التزام نہ کرے تو نہ صرف اس کا اپنا وجود معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے، بلکہ پوری ملکی معیشت میں ایک زبردست اختلال اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

معاملہ پھر محض مداخلت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے سارے ممالک نے اب منصوبہ بندی

کو راہنما اصول کے طور پر تسلیم کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ممالک جو براہِ راست اشتمالیت کی زد میں ہیں ان میں تو اس منصوبہ بندی نے ایک شدید جکڑ بندی (REGIMENTATION) کی صورت اختیار کر لی ہے، لیکن جو قومیں آزاد معیشت کی علمبردار ہیں وہ بھی اب اس بات پر مجبور ہو چکی ہیں کہ پیداواری قوتوں کے درمیان تطابق و توافق پیدا کرنے کے لیے اُن کی منصوبہ بندی کی جائے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ایک طرف تو حکومت کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف اُس کے ہاتھ میں اتنی زبردست قوت آگئی ہے کہ کوئی براہِ راست اقدام کیے بغیر وہ زندگی کی گاڑی کو جس رُخ چاہے بڑی آسانی سے موڑ سکتی ہے۔ ہماری زندگی میں معیشت کو جو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اُس سے ہر شخص پوری طرح آگاہ ہے۔ اس شعبۂ حیات کی صورت گری کرنے اور اسے اپنے منصوبے کے مطابق چلانے کے اختیارات جس قوتِ قاہرہ کو حاصل ہوں اس کی اثر آفرینیوں کا صحیح طور پر وہی آدمی اندازہ لگا سکتا ہے جس نے کبھی اس معاملہ کا گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کیا ہو۔ وہ قومیں جن کے ہاں ہم معاشی زندگی میں ایک طرح کی آزادی دیکھتے ہیں وہ اگرچہ اُس طرح پابہ زنجیر تو نہیں ہیں جس طرح کہ روسی اور ان کے زیر اقتدار لوگ ہیں لیکن اُن کے ہاں بھی آزادی اب محض نام کی رہ گئی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں قوت اور طاقت کی مدد سے لوگوں کو معاشی زندگی کے ایسے جیل خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے جن کی حد بندیوں کو لوگ بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اور جن کی تاریکیوں سے نکلنے کے ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں۔ مگر ان آزاد معیشت کے دعویدار ممالک میں لوگوں کو قید و بند میں ڈالنے کی بجائے نہایت عیاری اور ہوشیاری کے ساتھ ان کے گرد ایسی غیر محسوس دیواریں چُن دی جاتی ہیں، جن میں لوگ مقید تو ضرور رہتے ہیں مگر جن سے باہر نکلنے کی خواہش ان کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور خود مختار سمجھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ منصوبہ بندی کا "دستِ غیب" ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی۔ اشتراکیت کا جبر و تشدد ملک کے باشندوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہے مگر آزاد معیشت میں منصوبہ بندی کا فسوں لوگوں کے فکر و احساس کی صورت گری کرتا ہے۔

قریب قریب یہی حال سیاست کا ہے۔ اب مملکت اور حکومت کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر اس قدر محیط ہے کہ مملکت خود ایک مستقل دین بن گئی ہے جو اپنے دائرۂ اثر میں کسی دوسری مؤثر طاقت کے وجود کو برداشت نہیں کرتی۔ آج مملکت اپنے ہر شہری سے یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی جان، مال، اولاد، عزت، آبرو، حتیٰ کہ ضمیر و ایمان تک کو قربان کردے اور اپنی تمام خواہشوں اور امنگوں کو بھی اس کی مشیّت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کی دوستی اور دشمنی، اس کی پسند و ناپسند بلکہ اُس کی حیات و ممات بھی ریاست کی خاطر ہو۔ مانگے تو اسی سے مانگے اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔ جدید مملکت عہدِ حاضر کا سب سے بڑا معبود ہے۔ آج وہ فرد سے مکمل اور بلاشرکتِ غیرے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہی فرد کو ایک پوری شریعت دیتی ہے جو اس کی زندگی کے تمام جزئیات و فروع کا احاطہ کر لیتی ہے، اور وہی اپنے نظامِ تعلیم اور وسائلِ نشر و اشاعت کے ذریعہ سے افراد کے لیے عقائد، تصورات، نظریات اور فلسفۂ حیات و ممات متعین کر دیتی ہے۔ یہ نیا رنگ جو موجودہ دور میں ریاست نے اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے صرف یہی نہیں کہ اسے انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل ہو گیا ہے، بلکہ درحقیقت عملاً وہ خدا اور دین کی پوری پوری مدِمقابل بن گئی ہے۔

آج سے دو سو سال قبل اسٹیٹ کی یہ حالت نہ تھی۔ ایک طرف ذرائع رسل و رسائل کی کمی کی وجہ سے اس کی گرفت تمام علاقوں میں یکساں طور پر مضبوط نہ ہوتی تھی۔ وہ صرف اسی بات پر قانع رہتی تھی کہ اس کے زیرِ اقتدار رہنے والے لوگ صرف اسے محصولات ادا کر دیا کریں۔ اور اس کے اقتدار کو کسی طرح چیلنج نہ کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر نہ تو اس کا کوئی مطالبہ تھا اور نہ یہ کسی بات کی آرزومند تھی۔ اس کے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی فہرست میں بالعموم تین چیزیں شامل ہوتیں، خارجی دفاع، اندرونی نظم و نسق اور معاہدات و مواثیق کی تعمیل کروانا۔ یہی وجہ ہے کہ جو فسق و فجور، جو برائی اور خرابی، عیش و تنعم کی جو مختلف شکلیں دربار و ایوان میں جنم لیتیں، وہ زیادہ تر وہیں تک، یا حد سے حد تک دارالسلطنت کی سوسائٹی

تک محدود رہتیں، ان سے آگے نہ بڑھنے پاتیں۔ سوسائٹی کا عام طبقہ ان برائیوں اور گمراہیوں کے اثرات بد سے بڑی حد تک محفوظ و مامون رہتا۔ ریاست اُس زمانے میں انسانی زندگی کا احاطہ کرنے پر عملاً قادر بھی نہ تھی، اور ایسے ہمہ گیر پروگرام لے کر ریاستیں اس زمانے میں اُٹھتی بھی نہ تھیں۔

دوسرے مملکت اپنے آپ کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد نہ سمجھتی تھی۔ مذہب کی حقیقی روح اپنی پوری تازگی اور قوت کے ساتھ نہ سہی، کم از کم ایک کمزور اور معمولی شکل میں اس دَور کے سارے افکار و اعمال میں جاری و ساری تھی اور ریاست بھی اس بات پر مجبور تھی کہ اس کی برتری اور بالادستی کو تسلیم کرے۔ چنانچہ وہ لوگ جو با اختیار تھے وہ اپنی ساری بدعنوانیوں اور بے حیائیوں کے باوجود اتنی جرأت نہ رکھتے تھے کہ علانیہ اخلاقی اقدار اور معیارات بدل ڈالیں اور دانستہ اُن برائیوں کی اشاعت کرنے لگیں جنہیں مذہب و اخلاق مذموم قرار دیتے ہیں۔ ان حالات میں اگر مذہب اور سیاست کی تفریق کا کوئی قائل تھا بھی تو اس سے اتنی بڑی قباحت رونما نہ ہو سکتی تھی جتنی آج ہوتی ہے، کیونکہ اس زمانے میں سیاست کا دائرہ اپنے جبروت اور اقتدار کے باوجود ہمہ گیری کی قوت سے محروم تھا۔ اور زندگی کے میدان میں مذہب کے دائرے کے لیے بھی کافی گنجائش باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن آج اس عہد میں جس میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب مذہب اور سیاست کی تفریق کا فلسفہ یہ معنی رکھتا ہے کہ سب کچھ قیصر کا ہو جائے اور خدا کا کچھ بھی نہ رہے۔ اب سلطنت اپنے اوپر کسی ہستی کی بالاتری نہیں مانتی جس کا کوئی حکم اس کے اختیارات کو محدود کر سکتا ہو، اور اس کے برعکس وہ افراد سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس کی لا شریک بالاتری کو تسلیم کریں اور اپنے آپ کو بالکل اس کی اطاعت میں دے دیں۔ اگر ریاست مناسب سمجھے تو لوگوں کو نجی طور پر مذہب و اخلاق کی پیروی کرنے کی اجازت دے دے، لیکن اول تو وہ خود مذہب اور اخلاق سے بالا ہے، دوسرے انسانی زندگی پر اس کی بالاتری اس قدر مکمل ہے کہ نجی زندگی میں مذہب و اخلاق کے دائرے کی وسعت کا انحصار نہ تو مذہبی احکام پر ہے نہ افراد کے شخصی اعتقاد پر، بلکہ وہ سراسر ریاست کی مرضی پر منحصر ہے۔ جتنا وہ چاہے گی اس کو پھیلنے دیگی اور جتنا چاہے گی سکیڑ دیگی۔ یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو انتہائی مذہب پرست آبادی

کے بطن سے سخت مذہب دشمن نسل اٹھا کر دکھا سکتی ہے۔

مملکت کی اس ہمہ گیری اور الوہیت کے دعووں میں، جن کی عملی تعبیر ہم آج کل کی کلیت پسند یا نیم کلیت پسند ریاستوں میں دیکھ رہے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی طبقہ اپنے مذہب اور دین و ایمان پر قائم رہ سکے، خصوصاً جبکہ اس کا دین و مذہب عیسائیت یا بودھ مت جیسا مسکین مذہب نہ ہو بلکہ اسلام جیسا کلیت پسند مذہب ہو جو زندگی کے سارے گوشوں پر اسی طرح حاوی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جس طرح آج کل کی ریاست کرتی ہے۔ اب تو اعلائے کلمۃ الحق کی واحد صورت یہی ہے کہ ریاست کو اسی حق کا تابع بنایا جائے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اسی حق کو عملاً ریاست بنا دیا جائے جس پر آپ ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ لادینی ریاست میں محض لاؤڈ اسپیکر پر کلمۂ حق بلند کر کے یہ سمجھ لینا کہ ہم اعلائے کلمۃ الحق کر رہے ہیں صرف ایک غلط فہمی ہے جس کی تہ میں حقیقت کا ایک ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے۔

جب تک مسلمان ریاست کے بارے میں اس جدید رجحان اور اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے اس وقت تک کوئی ایسا انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا جس میں نظامِ حیات کے بدلنے کا داعیہ ہو۔ آپ آج چراغ لے کر ڈھونڈیئے اور حیاتِ انسانی کے کسی ایسے خانے کی تلاش و جستجو کیجئے جس پر مملکت کے اثرات پوری طرح نمایاں نہ ہوں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپ اس معاملہ میں جتنی سعی و جہد کریں گے اس میں آپ کو اتنی ہی ناکامی ہوگی۔ اب زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا منفذ بھی ایسا نہیں رہا جس میں مملکت کے رجحانات نفوذ نہ کر گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے کہ اس میں زندگی کے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ جہاں اطمینان اور سکون کے ساتھ الگ بیٹھ کر پہلے لوگوں کی تربیت کی جائے اور پھر انہیں لا کر باطل کے خلاف ایک دم صف آراء کر دیا جائے۔ فسق و فجور کا وہ طوفان جو حکومت کے چشمہ سے اُبل کر آتا ہے وہ اتنا طاقتور اور خوفناک ہوتا ہے کہ اس کے دائرہ اثر میں کوئی جزیرہ اس کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور نہ ایسے کسی جزیرے کو یہ فاسق و فاجر حکومتیں پنپنے کا موقع دیتی ہیں۔ جس میں ان کو کسی مدمقابل طاقت کے ابھرنے کا کچھ بھی امکان

اسلام میں مقامِ اجتہاد اور دائرہ قانون سازی

(جناب مصطفیٰ احمد زرقا پروفیسر قانون اسلامی لاء کالج شام)

[یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ کی ایک نشست میں مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو یونیورسٹی ہال میں پڑھا گیا۔ ادارہ ترجمان القرآن نے اس کا ترجمہ خود کروایا ہے]

محترم حضرات!

اجتہاد پر گفتگو قدیم اور جدید دونوں حیثیتیں رکھتی ہے۔

وہ ایک قدیم موضوع ہے جس پر ہمارے بزرگوں نے سیر حاصل بحث کی ہے اور نہ صرف یہ کہ اس کی حقیقت، اس کے شرائط اور اس کی ضرورت پر تفصیلی نظر ڈالی ہے بلکہ ان اوصاف کو بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، جن کا مجتہدین میں علیٰ وجہ الکمال پایا جانا ضروری ہے۔ متأخرین ہمیں بتلاتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسی قبیل کے دوسرے مباحث بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔

اور جدید ہم اسے اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر ایک نئے اسلوب سے بحث کرنا، اسے اُن جدید زاویوں اور گوشوں سے دیکھنا لابدّ ہے، جن زاویوں اور گوشوں سے اس پر بہت کم نظر ڈالی گئی ہے اپنے اس مقالہ میں جس کے لیے صرف پندرہ منٹ رکھے گئے ہیں، میں اجتہاد کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتا اس لیے چاہتا ہوں کہ اس تنگ وقت میں آپ حضرات کے سامنے اجتہاد سے متعلق صرف چند نئے ملاحظات (REMARK) ایک ایسے جدید زاویے سے پیش کروں کہ ہم ماضی سے روشنی حاصل کر کے مستقبل کے لیے ایک رستہ تلاش کریں۔

فقہاء کی اصطلاح میں اجتہاد کا مفہوم | اجتہاد۔ جیسا کہ اس کی فقہی تعریف سے مستفاد ہوتا ہے ۔ نام ہے نوبہ نو واقعات و مسائل میں شریعت کے تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کرنے کا۔

اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ شریعت میں ہر اُس مسئلہ کا حکم موجود ہے جو وجود میں آسکتا ہے اور اس میں ایسے کافی دلائل پائے جاتے ہیں جو ایک تحقیق شعار مجتہد کی اس شرعی حکم کی طرف رہ نمائی کر سکتے ہیں۔

یہ شرعی دلائل ــ جیسا کہ علمائے شریعت کے نزدیک معلوم و مبرہن ہے ــ چار ہیں:

۱۔ نصوصِ قرآن } اپنی دلالت کے تمام وجوہ واشکال سمیت
۲۔ نصوصِ سنت }

۳۔ علمائے اسلام کا اجماع، خواہ وہ کسی دَور میں ہو۔

۴۔ قیاس۔

ان چاروں حقیقی دلائل کے ساتھ ساتھ تین ذیلی ماخذ اور ہیں، جن کا اعتبار کتاب و سنت سے ثابت ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ استحسان: یہ استثنائی حکم ثابت کرنے کا وہ طریقہ ہے جس میں بوجوہ چند قیاس کے اصول و قواعد سے ہٹ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ استصلاح یا مصالح مرسلہ: یہ وہ قاعدہ ہے جس کی رُو سے ان مسائل میں جن کا دامن مثبت یا منفی نص سے خالی ہے، محض تنظیمی اور اصلاحی ضرورت کے پیشِ نظر شرعی حکم ثابت کیا جاتا ہے۔ اس میں قیاس کے اصول کی مخالفت نہیں ہوتی۔

یہاں ہم ان لوگوں کی رائے سے صرفِ نظر کرتے ہیں جنھوں نے استصلاح یا استحسان یا قیاس کے اعتبار کو موردِ اختلاف قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی مخالفت نفع و ضرر دونوں سے عاری ہے۔

۳۔ عُرف: جو نصوصِ شریعت اور اس کے مسلّمہ اصول سے متصادم نہ ہو۔

شرعی دلائل کی اس تحدید اور اجتہاد کے مفہوم کی اس تعیین سے ہمارے لیے آسان ہوگیا ہے کہ ہم اس کی روشنی میں دَورِ اجتہاد کا پتہ لگالیں۔

دَورِ اجتہاد | دورِ اجتہاد سے ہماری مراد اس کا وہ وظیفہ ہے، جو اس نے فقہ اسلامی کی بنیادوں کے

استحکام اور اس کے احکام کے انطباق میں پہلے بھی ادا کیا ہے اور آج بھی ادا کر رہا ہے۔

دورِ اجتہاد پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمارے لیے مفید و مناسب ہو گا، اگر ہم فقہ اسلامی میں اس کا صحیح مقام معلوم کر لیں۔

یہاں ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد کو اسلامی شریعت میں روح کا درجہ حاصل ہے اور فقہ اسلامی میں وہ سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ عقل اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ شریعت اجتہاد سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض انجام دے سکے یا اس کے جلو میں ایک ایسا صحت مند اور توانا قانونی مجموعہ مرتب ہو سکے جو استمرار و تسلسل کے ساتھ انسانی ضروریات و مصالح کی تنظیم کرتی رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں جب سے شریعت وجود میں آئی ہے، اجتہاد اس کا دمساز رہا ہے۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مسائل میں اجتہاد فرمایا ہے اور آپ کی زندگی اور آپ کی رہ نمائی میں صحابہ کرامؓ نے بھی اکثر معاملات کی گتھیاں اپنے دستِ اجتہاد سے سلجھائی ہیں۔

اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کا معلّم اور قاضی بنا کر بھیجا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ نے دریافت فرمایا:

"معاذ! تم ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کیسے کرو گے؟"

عرض کیا: کتاب اللہ سے!

ارشاد ہوا، اگر اس میں نہ ملا؟

بولے: سنتِ رسول اللہ سے!

فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملا، تو؟

جواب دیا: پھر میں اجتہاد سے کام لوں گا اور اپنی سعی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا (یعنی میں اجتہاد میں حق و صواب کی تلاش میں اور روحِ شریعت سے قریب تر پہنچنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا)۔

سرکارِ رسالتؐ، یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے، جس نے اپنے رسولؐ

کے نمائندے کو اپنی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اس بات کا ثبوت کہ اجتہاد اسلامی شریعت کی روح اور فقہ اسلامی کی حیات ہے، ہمارے پاس یہ ہے کہ اجتہاد کا اسلام کے مقصد اور اس کی خصوصیات کے ساتھ اتنا محکم، اتنا مضبوط تر ربط ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ شریعت میں اجتہاد کا حقیقی مقام معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے مقصد اور اس کی خصوصیات پر نگاہ ڈالیں تاکہ ان دونوں چیزوں کا اجتہاد سے جو عمیق اور ناقابلِ شکست رابطہ ہے وہ ہم پر واضح ہو جائے۔

اسلام کا مقصد اور اس کی خصوصیات: نصوصِ کتاب و سنت کے مطابق اسلام کا مقصد پوری انسانیت کی صلاح و فلاح ہے، جو اس کے تمام انفرادی و اجتماعی حالات کو شامل اور اس کے حال و استقبال کو محیط ہے اور یہی اسلام کے متعلق ایک مسلمان کا عقیدہ ہے جس میں ذرا سی بھی کمی اسلام سے خروج کے ہم معنی ہے۔

اسلام کے اس مقصد سے جو خصوصیات متفرع ہوتی ہیں، وہ یہ تین ہیں:

(۱) آخریت: یعنی آسمانی مذاہب میں اسلام آخری مذہب اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین ہیں۔ چنانچہ اب نہ کوئی ایسی شریعت آنے گی جو اسلام کو منسوخ کرنے والی ہو اور نہ کوئی نیا پیغمبر ہی مبعوث ہوگا۔

(۲) خلود: یعنی اسلام کی دعوت وقت کی پابندیوں سے ماوراء ہے، مستقبل کی پہنائیوں میں ایسی کوئی حد نہیں، جہاں پہنچ کر اس دعوت کے وجوب کے قدم رک جائیں اور اس کے بعد وہ انسانوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ اسلامی شریعت کی اتباع و تطبیق کے مکلف ہوئے بغیر اپنی زندگی کی تنظیم خود کریں۔

(۳) اسلامی شریعت کے قانونی نظام میں استیعابِ عام: یعنی شریعت کے احکام اور اس کے اصول و قواعد — جن سے اسلام کا قانونی نظام ترکیب پاتا ہے — تمام پیش آنے والے اور ممکن الوقوع مسائل کو محیط ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ہر زمانے اور ہر جگہ کی قانونی ضرورتیں

کو پورا کر سکیں۔ اس لیے کہ قواعدِ شریعت میں ایک عمومیت، ایک لچک ہے، اصلی اور استثنائی تدابیر ہیں اور مختلف حالات کی رعایت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے شریعت نے فقہ کی کتابوں میں مختلف اور مناسب مقامات پر اس امر کی صراحت کی ہے کہ موجودہ اور آئندہ زمانے میں ایسا کوئی واقعہ ظہور پذیر ہونے والا نہیں ہے، جس کے لیے اسلامی شریعت میں کوئی ایسا حکم نہ ہو جو اپنی بنیاد کسی نص یا کسی قیاس یا کسی اجتہاد پر نہ رکھتا ہو اور اسلام کے پنجگانہ احکام: ایجاب، استحسان، اباحت، کراہت اور تحریم کے تحت نہ آتا ہو۔

میں اس عاجلانہ مقالے میں اس تیسری خصوصیت کی صحت پر دلیل لانے اور اس کی نظیریں پیش کرنے سے صرفِ نظر کروں گا کہ فقہائے اسلام کے نزدیک یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے اور اپنی جگہ بالکل درست!

نتیجہ | جب اسلام کا مقصد اور اس کے خصائص وہ ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے تو ہمارا یہ دعویٰ آپ سے آپ ثابت ہو گیا کہ اجتہاد اسلامی شریعت میں روح کا درجہ رکھتا ہے اور وہ فقہ اسلامی کا سرچشمہ حیات ہے۔ اس لیے کہ عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ یہ شریعت ایک طرف تو آخری اور سرمدی ہو، اس میں ہر موضوع، ہر پیش آنے والے مسئلہ اور ہر ممکن الوقوع حادثہ کے لیے احکام ہوں اور دوسری طرف اس کی آغوش ایک قائم و دائم اجتہاد سے خالی ہو۔

علامہ شہرستانی اپنی کتاب "الملل والنحل" میں فرماتے ہیں:

"عبادات و معاملات میں واقعات اس کثرت سے رونما ہوتے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم بہ طورِ یقین جانتے ہیں کہ ہر واقعہ میں نص موجود نہیں ہے اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ پس جب نصوص محدود ہیں اور واقعات نامحدود اور محدود کسی نامحدود کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتا تو قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ قیاس اور اجتہاد کا اعتبار ضروری ہے تاکہ ہر نئے واقعہ کے لیے اجتہاد کیا جا سکے۔"

متذکرہ بالا صراحت نے واضح کر دیا کہ اجتہاد کا توقف اسلامی شریعت کے خصائص سے کسی عنوان

میل نہیں کھاتا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر نئے نئے حالات، نئی نئی ضرورتیں اور ایسی ایسی مشکلیں پیش آتی رہیں گی، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں شریعت کی نصوص اور اس کی روح سے اخذ کردہ مناسب حل کی ضرورت پڑے گی۔

ان حالات میں اجتہاد کے توقف کے معنی یہ ہوں گے کہ فقہ اسلامی جمود و تعطل کا شکار ہو گئی اور وہ نئے مسائل اور جدید مشکلات کا شرعی حل پیش نہیں کر سکتی۔ اور یہ ایسی بات ہے جو خصائص خلود کے بھی منافی ہے اور شریعت میں تمام حوادث و واقعات کا شافی جواب دینے کی جو صلاحیت ہے اس کی بھی نفی کرتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں ہم اجتہاد کو دو زمانی حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) اجتہاد کا گذشتہ دور

(۲) اجتہاد کا آنے والا دور

اور یہ دونوں دور، طبعی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

اجتہاد کا گذشتہ دور اجتہاد نے شریعت کی خدمت اور فقہ اسلامی کے عظیم الشان محل کی تعمیر میں اپنے فرائض بڑی خوبی سے ادا کیے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو خلاء پیدا ہو گیا تھا، اجتہاد نے اُسے باحسن وجوہ پُر کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد احکام سے متعلق قرآن کی جو آیات چھوڑیں، ان کی تعداد چند سینکڑوں سے آگے نہیں بڑھتی اور یہی حال ان احادیث کا ہے، جو احکام پر مشتمل ہیں۔ لیکن اپنی اس قلتِ تعداد کے باوجود ان نصوص میں وہ لچک، وہ عمومیت وہ ہمہ گیری، وہ قوتِ تعلیل اور مستحکم لافانی بنیادوں پر استوار وہ قانونی اصول و مبادی ہیں جنہوں نے اپنے قانونی نظریات و قواعد اور دانشمندانہ احکام کی فراوانی کے سبب فقہ و اجتہاد کی امداد و اعانت کے لیے ایک ٹھوس اور پائیدار اساس کا کام دیا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن مجید کا ارشاد: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا فرمان : لاضرر ولاضرار

ضرار کے معنیٰ ہیں نقصان کے بدلے کسی کا نقصان کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کا مال تلف کر دیا ہے تو جواب میں اس کا مال تلف کرنا جائز نہیں، بلکہ تلف شدہ مال کا معاوضہ وصول کرنا چاہیے۔

ابتدائی تین صدیوں میں صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور تبع تابعین میں سے جزیرۃ العرب ہی میں نہیں، بلکہ تمام مفتوحہ ممالک میں اس کثرت سے مجتہدین پیدا ہوئے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ہر مجتہد، نصوص کے فہم و ادراک، احکام کی تخریج و استنباط اور انھیں جدید حالات پر منطبق کرنے میں اپنا ایک جدا اصول اور اپنی ایک الگ روش رکھتا تھا، البتہ ان اصولوں میں وہ کبھی آپس میں متفق ہو جاتے اور کبھی ایک دوسرے سے اختلاف کرتے۔

اس طرح ان ابتدائی تین صدیوں میں جتنی کثرت سے یہ مجتہدین پیدا ہوئے اتنی ہی کثرت سے اجتہادی مذاہب وجود میں آئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہر مجتہد کا اپنا الگ طریقِ فکر و نظر ہوتا تھا، جو تمام مسائل میں اس کی فقہی رایوں اور اجتہاد سے تدوین و تشکیل پاتا تھا۔ یعنی ہر مذہبِ فکر تمام مباحث و فصول میں ایک مکمل شرعی قانون مرتب کرتا تھا۔

ان میں سے بہت سے مذاہب اپنے اپنے مجتہد کی وفات کے ساتھ محو ہو گئے اور ان کے صرف چند بچے کھچے دھندلے سے نقوش رہ گئے جو کتبِ اختلاف میں بکھرے پڑے ہیں، لیکن بعض مذاہب کو ایسے تلامذہ میسر آگئے جنھوں نے اپنے امام مذہب سے جو کچھ سنا، اس کی داشت و پرداخت کی، اسے کتابوں کی صورت میں مدون کیا اور اس کی ترویج و اشاعت میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ان مذاہب کو قبول کر لیا اور انھیں کمال و دوام حاصل ہو گیا۔ لوگوں نے صدیوں ان کی خدمت کی اور انھیں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ یہ مذاہب آج مذاہبِ اربعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ پھر چونکہ یہ اجتہادی مذاہب مکمل ہو کر رواج پذیر ہو گئے تھے، ان کی اپنی اپنی فقہ میں کتابیں مدون ہو چکی تھیں اور امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ رفتہ رفتہ علومِ شریعت اور علم لغت میں — جو مجتہدانہ قابلیت پیدا کرنے کا ضامن ہے — تبحر حاصل کرنے سے دور ہوتے جا رہے تھے، اس لیے

ان مذاہب کے متبعین کی کثرت ہوگئی اور لوگ انہی کی تقلید پر تکیہ کرنے لگے تا آں کہ سلطنتِ عباسیہ کے زمانۂ عروج میں دنیائے اسلام کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں ان مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب کی سیادت اور اس کے اپنے قاضی اور اپنے مفتی نہ ہوں۔

پھر ان مذاہبِ اربعہ کے ماننے والے بڑے بڑے علماء نے تفریع و توسیع اور تخریج و تالیف کے انبار لگا دیئے، جس سے متبعین نے سمجھ لیا کہ اب کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اجتہادِ مطلق کی صلاحیتیں نادر و کمیاب ہو گئی تھیں، اور اندیشہ تھا کہ کہیں جمہورِ امت میں حقیقی اجتہاد کو جانچنے کی صلاحیت کمزور نہ پڑ جائے ایک نا اہل اجتہاد کا دعویٰ لے کر اٹھے اور لوگوں کو دھوکے میں ڈال کر ان کا دین فاسد کر دے چنانچہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔

لیکن ان مذاہب کے اصول کے تحت ایک مفید تحریک چلتی رہی مختلف زمانوں میں علمائے کرام نے اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے جدید مسائل کے اجتہادی حل پیش کیے جن میں قیاس یا استحسان یا مصالحِ مرسلہ کے قاعدہ کو بنیاد بنایا گیا تھا۔

چنانچہ پانچویں صدی ہجری میں اسی طریق سے کام لے کر حنفی مذہب میں سود کے اشکال سے بچنے کے لیے بیع الوفا کے احکام وضع کیے گئے اور مختلف مذاہب کے متاخرین فقہاء نے قرض خواہوں کی رضامندی کے بغیر اس مقروض کا وقف اور دوسرے تمام تصرفات ممنوع قرار دے دیئے، جس کے تمام مال پر قرض کی رقم حاوی ہو تا کہ وہ قرض خواہوں کا مال وقف یا ہبہ یا اسی طرح کی دوسری صورتوں سے ہضم نہ کر سکے یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے مسائل ہیں، جو استحسان کے ذریعے حل کیے گئے۔

لیکن مذاہب کے تحت یہ مقیدا جتہاد بھی وقت کے ساتھ ساتھ تحلیل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ انجام کار فقہ اسلامی جدید نتیجہ آفرینیوں کے اعتبار سے بالکل بانجھ ہو گئی اور فقہا کا کام صرف یہ رہ گیا کہ جو مسائل فقہی کتابوں میں درج ہیں انہیں طوطے کی طرح رٹ لیں انتہا یہ ہے کہ جو لوگ آج عالم یا فقیہ کہلاتے ہیں، انہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ فقہ کا مطالعہ کرتے وقت مذہبی احکام و آراء کے دلائل ہی تلاش کریں۔

اس مختصر سے تاریخی جائزے سے جو ہم نے پیش کیا، اس امر کی ایک اور نئی دلیل ہمارے سامنے

آگئی کہ اجتہاد، شریعت کی روح اور فقہ اسلامی کی حیات ہے۔

یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عثمانی سلطنت کے آخری دنوں میں دنیا دار حاکموں نے یہ سمجھ لیا کہ شریعت اور اس کی فقہ زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور جدید عصری تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی چنانچہ انھوں نے اجنبی قانون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور فقہ اسلامی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے کتاب خانوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس نتیجے کے ابتدائی آثار حافظ ابن قیم کے زمانے ہی سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے اس لیے کہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "الطرق الحکمیۃ" اور "اعلام الموقعین" میں نہایت پاکیزہ اور صحت مند بحث کی ہے۔ علامہ موصوف نے اپنی ان کتابوں میں مختلف مذاہب کے مقلدین کو ان کے جمود اور شریعت کے سرچشموں کو تنگ اور خشک کرنے پر لتاڑا ہے، جس کی وجہ سے مسلمان حکمران، ضروریات کی تکمیل کے لیے، اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرنے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ فقہی احکام کی تدوین و کتابت اب ختم ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ تنگی شریعت غرا میں نہیں، ان اتباع مذاہب کی خود اپنی غلطیوں میں تھی۔

ان حقائق کے بعد ایک صاحبِ فکر ناظر کو صاف نظر آجاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے سے اسلامی شریعت اور اس کی جلیل الشان فقہ پر کتنی بڑی افتاد پڑی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک اسلام کی خصوصیات، اجتہاد کی متقاضی ہیں، دنیا کی کوئی قوت اس کا دروازہ بند نہیں کر سکتی۔ حتی کہ مذاہبِ اربعہ کے اربابِ تقلید میں سے روشن خیال متاخرین نے اپنی کتابوں میں صراحت کی ہے کہ "اگر آج بھی کوئی شخص اپنے علم کی بنا پر مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہو جائے اور اس کی شرطوں اور صلاحیتوں سے بہ حد وافر بہرہ مند ہو، تو اس کے لیے مروجہ مذاہب میں سے کسی مذہب کی پیروی جائز نہیں۔" لیکن عملاً وہ کسی کے اس مرتبۂ بلند پر فائز ہونے کو تسلیم نہیں کرتے ان کے خیال میں اجتہاد کا دروازہ کھل تو سکتا ہے، لیکن اس کی کنجی کھو گئی ہے۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور و ممتاز شافعی فقہا میں سے ہیں، فرماتے

ہیں:

"اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے متعلق علماء نے مختلف باتیں کہی ہیں . . . . یہ تمام اقوال فاسد و بے بنیاد ہیں۔ اگر آج بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے، جس میں کوئی نص نہ ملے، یا اس کے بارے میں سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہو تو لازمی طور پر اسے کتاب و سنت کی روشنی میں اجتہاد ہی سے حل کیا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ہذیان کا مریض ہو۔"[۱]

اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے پر نہیں، اس کا سلسلہ رک جانے ہی پر سہی، منصفانہ حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک تحلیلی نظر ڈالیں، جس سے ماضی میں اجتہاد کا مزاج اور اس کی فطرت ہم پر واضح ہو جائے۔

ماضی میں اجتہاد کا مزاج اور اس کی فطرت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد پر شورائی اثر غالب تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اہم مسائل میں چاہے وہ حقوق سے متعلق ہوتے، یا سیاست سے، صحابہ کرامؓ کو جمع کرتے اور ان کے صلاح مشورے سے پیش آنے والے مسئلہ کا شرعی یا سیاسی حل تلاش فرماتے۔ اس سلسلہ میں اُن کا طرزِ عمل اس نص قرآنی کے عین مطابق تھا جو انہیں بلا تخصیص ہر معاملہ میں مشورہ کرنے کی ہدایت کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی مطابقت رکھتا تھا، جو حضورؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ نے سرکارِ رسالت علیہ التحیۃ والتسلیم سے دریافت کیا کہ اگر کسی مسئلہ میں مسلمانوں کو کتاب و سنت میں کوئی نص نہ ملے تو وہ کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا: علماء کو جمع کرو اور کسی انفرادی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔"

اس کے بعد جو دور آیا اس میں اجتہاد پر انفرادی رنگ غالب آگیا اور ہر مجتہد اجتہادی مسائل میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنے لگا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ اسلامی مملکت کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے تھے اور ان کا مشورے کے لیے کسی ایک جگہ جمع ہونا دشوار ہو گیا تھا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں چونکہ لوگ ظہورِ اسلام سے قریب العہد تھے۔ اس لیے ان کے دلوں میں

---

[۱] دیکھیے، استاذ عبدالوہاب الخلاف کا رسالہ "الاجتہاد والتقلید" ص ۱۶

اس کا اثر تازہ اور گہرا تھا اور تیسری صدی ہجری تک احادیث رسولؐ، روایت اور شخصی ملاقات کے ذریعے نقل ہوتی تھیں۔ اکثر و بیشتر لوگ قرآن و حدیث اور فقہ و لغت کی تحصیل میں ذہن کی پوری توانائی کے ساتھ ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے اور علم کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے تھے۔ اس لیے ثقہ اور پرہیزگار عالم دوسروں کے مقابلہ میں بآسانی پہچان لیا جاتا تھا۔

پھر جب زمانے نے لوگوں کو عہدِ رسالت سے ــــ جو درحقیقت اسلام کی مشعل تھا ــــ دُور کر دیا، معاشرے میں سے ایک حقیقی اور نمائشی عالم کی تمیز اٹھ گئی اور لیاقت و پرہیزگاری کی درخشانی دھندلا گئی تو مذاہب اربعہ کے متبعین کو چوتھی صدی ہجری میں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ مبادا کوئی اجتہاد کا دعویٰ لے کر اٹھے اور بدعتوں کی اشاعت، زہریلے خیالات و نظریات کی ترویج اور شریعت کے اصول و قواعد میں فساد پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ اِدھر انھوں نے دیکھا کہ رائج الوقت مذاہب کی تفریعات کافی و وافی ہیں اور ان حالات کے پیش نظر بابِ اجتہاد کو بند کر دینے کا فتویٰ صادر کر دیا۔

ماضی میں اجتہاد کے مزاج و فطرت کے اس تجزیہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی تاسیس کے ابتدائی دور میں، اُس عہد کے مجتہدین کی کوششوں سے انفرادی اجتہاد نے اس امت کو خیر و برکت سے مالا مال کر دیا۔ اس لیے کہ ان کے تمام عزائم کشتِ شریعت کو بونے جوتنے اور اسے زرخیز بنانے کے لیے وقف ہو گئے۔ اساطینِ علم نے قواعد کے استنباط کا مقدس فریضہ انجام دیا اور شریعت کے نصوص و قواعد کی روشنی میں فقہ اسلامی میں قانونی نظریات کی بنیاد ڈالی، یہاں تک کہ فقہ کا ایک عظیم الشان قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا جس میں اصول و نظریات بھی ہیں اور بے شمار فروعی احکام بھی۔ اور انھوں نے کبھی نہ خشک ہونے والا ایسا چشمہ بنا دیا ہے جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔ اگر ابتدائی تین صدیوں میں یہ انفرادی اجتہاد نہ ہوتا تو ہم کبھی یہ فقہی ثمرات و نتائج حاصل نہ کر سکتے۔

پھر یہ بھی بہتری اور دانش مندی کی بات تھی کہ اس کے بعد اُن خطرات کے پیش نظر، جو اس انفرادی اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنے کی صورت میں نمودار ہوتے تھے، اجتہاد کے دروازہ کو بند کر دیا جائے تا کہ بات بگڑنے نہ پائے۔ لیکن اس دروازے کو بالکل بند کر دینا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ

اسلامی شریعت اور اس کی فقہ جمود کا شکار ہو گئی ہے، وہ وقت کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہے اور اس میں زندگی کے آثار مفقود ہو گئے ہیں۔ اس سبب ضروری تھا کہ اجتہاد کے مفاسد کا علاج اجتہاد کی تحریم سے نہ کیا جاتا۔ بلکہ اس کی تنظیم کی جاتی اور اسے افراد کے ہاتھوں سے نکال کر جماعت کے سپرد کر دیا جاتا۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں آنے والے دور میں اختیار کرنا چاہیے۔

اجتہاد کا آنے والا دور ماضی میں اجتہاد کے متعلق جو غلطی ہوئی، اس کا علم ہو جانے کے بعد اب وہ طریق کار پوری وضاحت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ گیا، جو مستقبل میں ہمیں اجتہاد کے لیے اپنانا چاہیے۔

بلاشبہ انفرادی اجتہاد ماضی کی ایک ضرورت تھی۔ لیکن آج وہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ کیوں کہ جو خطرات کل تک واہمہ کی حیثیت رکھتے تھے، جن کے پیش آنے کا خوف چوتھی صدی ہجری میں دامن گیر تھا اور جن کی وجہ سے فقہائے مذاہب نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تھا، وہ آج ایک امر واقعی بن گئے ہیں۔

آج دین کے سوداگروں کی ریل پیل ہے اور غالباً ان میں سے اکثر نیکوکار اور خداترس علماء کے مقابلہ میں زیادہ وسیع العلم اور زیادہ سحر بیان بھی ہیں۔ آج ازہر کے بعض ایسے فارغ التحصیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جنہوں نے ایسی گمراہ کن کتابیں اور ضلالت آفریں فتوے لکھے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے علم کو دشمنانِ اسلام کے تصرف میں دے دیا ہے اور وہ قصرِ اسلام کے ستونوں کو خود اس طرح ڈھا رہے ہیں کہ اسلام کے دشمن کبھی نہ ڈھا سکتے۔ اب یہ لوگ یا تو دین سے خارج ہیں، یا اجتہاد اور حریتِ فکر کی ٹٹیوں کی آڑ میں شکار کھیلنے والے خائن و منافق!

اس کے علاوہ وہ بڑی بڑی مادی منفعتیں حاصل کر رہے ہیں، دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں اور خدا کی لعنت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

پس اگر ہم شریعت کی روح اور فقہ اسلامی کی زندگی کو اجتہاد کے ذریعہ واپس لانا چاہتے ہیں اور اس کا امت میں جاری رہنا واجب سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہی وقت کی بے شمار مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شرعی حل پیش کرنے کا تنہا راستہ ہے، — وہ شرعی حل، جن میں تحقیق کی گہرائی اور دلیل کی پختگی ہو، جو ہر قسم کے شکوک و شبہات اور طعن و تشنیع سے دُور ہوں اور جن میں تقلیدی لاشوں اور

حق سے بغاوت کرنے والی عقلوں کا سر کچلنے کی یکساں صلاحیت ہو، تو اس کا بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ اجتہاد کی بنیاد ایک نئے اسلوب سے رکھی جائے، یعنی انفرادی اجتہاد کی جگہ اجماعی اجتہاد کو دے دی جائے اور اس طرح ہم اجتہاد کو اس کے پہلے مقام پر لے آئیں، جہاں وہ حضرت ابو بکرؓ صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مبارک دور میں تھا۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے علمی اور لغوی اداروں (اکیڈیمیوں) کی طرح ہم فقہ اسلامی کا ایک ادارہ قائم کریں، جس میں تمام اسلامی ممالک کے وہ مشہور و پختہ کار فقہاء شریک ہوں، جو شرعی علوم کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی روشنی سے بھی بہرہ مند ہوں اور جن میں سیرت و کردار اور صلاح و تقویٰ کی بھی تمام خوبیاں موجود ہوں۔

اس کے ساتھ ہی جدید علوم و فنون مثلاً اقتصادیات و اجتماعیات اور قانون و طب وغیرہ کے راسخ العقیدہ مسلمان ماہرین بھی اس ادارے میں شامل کیے جائیں تاکہ فقہاء فنی معاملات میں ان کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس فقہی ادارے کے تمام ارکان باقی اور مشاغل سے فارغ ہونے چاہئیں۔ ان کے لیے ایک وسیع کتب خانہ فراہم کیا جائے۔ .... اور ان کے لیے اقتصادی فراغت کا اہتمام ہو تاکہ وہ طمانیتِ خاطر کے ساتھ اپنے موضوع — اجتہاد — کا مطالعہ کریں اور وقت کے ہر اس دشوار مسئلہ پر جو ان سے بحث و تحقیق کا طالب ہو، اسلامی احکام منطبق کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ اسی طرح ان کے تحقیقی مقالات کی اشاعت کے لیے ایک ماہنامہ جاری ہونا چاہیے۔ اور فقہ اسلامی کا ایک مبسوط مجموعہ بھی، دوسری قوموں کی انسائیکلو پیڈیا کے طرز پر مرتب ہونا ضروری ہے۔ نیز اس ادارے کو مختلف فقہی مذاہب کی اہم کتابوں کی ایک نئی فہرست، بترتیب ابجد شائع کرنی چاہیے تاکہ محققین بغرض استفادہ ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکیں۔ اس کے علاوہ اور بھی فقہی خدمات ہیں، جن کی اجتہاد کے سلسلے میں عصر حاضر کو ضرورت ہے۔

یہ اسکیم بہت بڑے سرمائے کی محتاج ہے، جس کے حصول کی بس یہ دو صورتیں ہیں:

ا۔ تمام مسلمان قوموں سے چندہ کے طور پر یہ سرمایہ حاصل کیا جائے ___ لیکن موجودہ حالات میں یہ ناممکن ہے ___ اس لیے کہ عوام اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں اور مہذب طبقہ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

۲۔ ایک یا چند اسلامی حکومتیں اس اسکیم کو اپنالیں اور اس کے لیے اپنے بجٹ میں رقم مخصوص کریں۔

اس قسم کا فقہی ادارہ قائم کرنے کی تجویز ان دو اسلامی کانفرنسوں میں منظور ہو چکی تھی جو ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں منعقد ہوئی تھیں اور جن میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ تجویز فقدان وسائل کے سبب رو بہ عمل نہ آسکی اور کاغذ پر سیاہی کے خطوط و دوائر سے آگے نہ بڑھی۔ اس لیے کہ موجودہ زمانے کی اسلامی حکومتیں ___ افسوس ہے کہ ___ اور تمام مدّوں میں روپیہ خرچ کرسکتی ہیں اور نہیں کرسکتیں تو صرف اسلام کی مد میں۔ سچ فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر نے اپنے اس ارشاد میں:

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔

اسلام اور سائنس

(ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی)

(یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ میں چار جنوری ۱۹۵۸ء کو پڑھا گیا۔ اصل مقالہ انگریزی میں تھا یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔)

اس مختصر مقالہ میں اُس طرز فکر کا جائزہ لیا گیا ہے جو اسلام نے سائنس اور دوسرے علوم کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید سائنس کی اہم ترین خصوصیات کے بارے میں قرآن حکیم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات پیش کی جائیں۔ یہ کوئی تاریخی مقالہ نہیں جس میں ہم سائنسی افکار کی تخلیق میں مسلمانوں کی خدمات بیان کریں بلکہ اس مضمون کا مقصد صرف اس حقیقت کی نشاندہی کرنا ہے کہ اسلام نے اپنے متبعین کے اندر فکر و احساس کی وہ کونسی لو لگائی، جس کی وجہ سے وہ علم کی تلاش میں سرگرم عمل ہوئے اور انھوں نے اس کی نشو و نما میں نہایت نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔ اس مضمون میں میں نے لمبی اور طویل بحثوں سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے اصل مسئلہ کے ثبوت میں قرآن حکیم اور حضور سرور کائنات کے چند ایک اقوال کو نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

آیئے ہم سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ جدید سائنس کے خصائص کیا ہیں تاکہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر متعین کرنے میں آسانی ہو۔ میرے نزدیک سائنس کی اہم ترین خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اولاً یہ امر مسلّم ہے کہ علم اور ہنر کا حصول ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ کم از کم اصول کی حد تک اس حقیقت کو اب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر فرد و بشر اس بات کا پورا استحقاق رکھتا ہے کہ وہ جس قدر چاہے علم حاصل کرے اور کوئی چیز اُس کی راہ میں مانع نہ ہو۔

ثانیاً سائنس کی تعلیم مشتمل ہے تجربات و نظریات، مشاہدات اور اُن کی ترتیب پر۔ سائنس کی بنیاد نہ تو مجرد تجربہ پر رکھی گئی ہے اور نہ ہی محض تصورات پر۔ یہ علم در حقیقت تفکر اور مشاہدہ کے حسین امتزاج کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔

ثالثاً۔ یہ احساس اب ہمہ گیر ہو رہا ہے کہ سائنس کو ہماری روزمرّہ زندگی میں بڑا اہم عمل دخل ہے۔ انسان کو علم کی بدولت وہ قوت وطاقت میسر آئی ہے جس کی مدد سے اس نے عالمِ طبیعی کی تسخیر کی ہے۔

اب میں کوشش کرونگا کہ ان تینوں اہم خصائص کے متعلق اسلام کے اساسی تصورات کی وضاحت کروں۔

(۱) سب سے پہلی بات کو ہی لیں یعنی علم حاصل کرنے کا بنیادی اور عمومی حق۔ موجودہ دَور میں جبکہ تعلیم عام اور لازمی ہے اور جب انسان کے بنیادی حقوق ایک مسلمہ حقیقت بن چکے ہیں لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انسانی تاریخ کے ایک بہت طویل دور میں علم حاصل کرنے پر معاشرے کے ایک نہایت ہی مختصر طبقہ کا اجارہ تھا۱؎۔ یہ طبقہ مذہبی راہنماؤں کا وہ گروہ تھا جس کو پادری کاہن یا برہمن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت مختلف حیلوں اور بہانوں سے عوام کو جاہل رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتی تاکہ وہ اُن پر اپنی برتری قائم کرکے اُن سے ناجائز فائدے حاصل کرتی رہے۔ چنانچہ یہ اصول وضع کر دیا گیا کہ کوئی عام شخص علم حاصل نہیں کر سکتا۔ طرح طرح کی سزاؤں، ایذارسانیوں اور دردناک انجام سے خوفزدہ کرکے ایک انسان کو تعلیم کے حصول سے باز رکھا جاتا۔ مذہبی رہنما اپنی ان معلومات کو جو انہیں کسوف وخسوف، یا اسی طرح کے دوسرے مظاہرِ قدرت کے بارے میں حاصل تھیں، بڑی ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ استعمال میں لاکر لوگوں پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جماتے۔

اسلام نے مذہبی راہنمائی کے اس مطلق العنانی کا خاتمہ کرکے دجل وفریب کے اس سارے ڈھانچہ کو ہی بدل ڈالا۔ اُس نے ہر مسلمان پر یہ واجب قرار دیا کہ وہ علم حاصل کرے۔ ممکن ہے آج کے اس دَور میں یہ بات کوئی غیر معمولی نظر نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے علم کو جس طریق سے

۱؎ اس سلسلہ میں اگرچہ بہت سے شواہد مل سکتے ہیں لیکن یہاں ہم صرف ایک مصنف رابرٹ برائی فالٹ (باقی اگلے صفحہ پر)

پاکستان بننے کے بعد حالات جس سرعت سے بدل رہے ہیں وہ ہر ہوشمند انسان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن دیکھیے، کیا فسق و فجور کو فروغ دینے میں کسی پر جبر و تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی نشر و اشاعت تو کبھی آرٹ اور ادب کے نام پر، کبھی دیہاتی فلاح و بہبود کے نام پر، کبھی قومی عزت و ناموس کے نام پر، کبھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نام پر نہایت خوبی سے کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ریڈیو سے لوگوں کا دل بہلا دیا جاتا ہے، کچھ فلموں کو سنسر کرنے میں ذرا سی چشم پوشی سے کام لے لیا جاتا ہے، کچھ مخلوط تعلیم کے ذریعہ سے قوم کی تعلیمی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور کچھ بڑھتی ہوئی آبادی کے مرض کا مداوا برتھ کنٹرول کے پروپیگنڈا سے کر دیا جاتا ہے۔ انہی ذرا سی تدبیروں کا نتیجہ یہ ہے کہ اصحاب اقتدار کے فاسقانہ عزائم کی فوج ظفر موج میدان پر میدان فتح کرتی چلی جاتی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہر روز وہ کتنے نئے خاندانوں اور افراد کو خراب کر دیتی ہے۔ اس فوج نے ہمارے عائلی نظام کے قلعہ میں رخنے پیدا کیے مگر ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ اور اب جب دشمن پوری طرح اندر گھس آیا ہے تو ہم بھی اتنے بدل چکے ہیں کہ اسے اپنے حق میں فال نیک خیال کر رہے ہیں۔ اس فوج کے مختلف دستے زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیل کر اپنا کام پوری تندہی سے کر رہے ہیں اور ہم ایک بے بس اور مجبور انسان کی طرح ان کی ریشہ دوانیوں کا تماشہ دیکھتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ہماری دینی حس اور حمیت کو اب اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہمارے اندر اس کے خلاف نفرت کی کوئی معمولی سی تحریک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ اپنی ذات میں خواہ کتنے ہی نیک اور پاکباز ہوں لیکن اس مسموم فضا کو کیا کریں گے جو آپ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ مدرسے میں، اخبارات میں، ریڈیو پر غرض ہر جگہ آپ کے کانوں میں وہی باتیں پڑیں گی جن کی ریاست ترویج و اشاعت کرنا چاہتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ پہلے ایک مدت صرف افراد بنانے میں صرف کرنی چاہیے، پھر ایک اور مدت صرف معاشرے کی اصلاح میں صرف ہونی چاہیے، پھر آخر کار اس انفرادی تیاری اور اجتماعی اصلاح کے نتیجے میں یا تو ریاست آپ سے آپ بدل جائے گی، یا نہیں تو وہ حملہ آور ہو کر ریاست کو بدل ڈالے گا، تو دراصل ایسا شخص اپنے خیالات ہی کی بنائی ہوئی دنیا میں رہتا ہے، واقعات کی دنیا سے اس کو کوئی

پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے کی اہمیت اس آیت میں نہایت صاف اور زوردار طریقے سے ظاہر کی گئی ہے چونکہ احکاماتِ الٰہی کی پیروی ہر مسلمان پر لازم ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ علم اور اُس کا حصول ہر مومن و مسلم کا مقدس فرض[ا] ہے۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ (الحدیث)	علم کا حصول ہر ایک مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

[ا] رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو جس قدر اہمیت دی ہے اُس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ بدر کی لڑائی میں جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ نے یہ قرار دیا کہ وہ مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ اس کے علاوہ بالغوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے حضورؐ نے یہ قاعدہ مقرر فرمایا کہ مدینہ کے باہر کے مسلمان اپنے میں سے کچھ ذی صلاحیت افراد کو مدینہ بھیجیں تاکہ وہاں تعلیم حاصل کرکے جب وہ لوٹیں تو پھر اُس سے پوری بستی کو بہرہ ور کریں۔ جن لوگوں کو حکومت کے بڑے بڑے مناصب عطا کیے جاتے انہیں بھی تعلیم کے متعلق خاص تاکید کی جاتی چنانچہ عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر مقرر فرماتے ہوئے کہا:

"تم حق پر قائم رہو جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور بھلائی کا حکم دو اور عوام کو قرآن کی تعلیم دو تاکہ ان میں اس کی سمجھ پیدا ہو اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکو۔ عوام الناس کی دلداری کرو یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں"۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبات میں بار بار فرمایا کرتے تھے:

اللھم انی اشھدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتھم لیعلموا الناس دینھم و سنۃ نبیھم۔	اے اللہ! میں اپنے تمام علاقوں کے عہدیداروں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبی کے طریقہ کی تعلیم دیں۔

ایک دوسرے خطبہ میں عوام کو اپنے عہدیداروں کے اس فرض سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

نیز یہ کہ علم کا حاصل کرنا ہر فرد و بشر پر واجب ہے خواہ اس کی تلاش اور جستجو کے لیے اُسے دنیا کے دور و دراز گوشوں میں جانا پڑے۔

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ — علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں ہو۔

اس طرح ہر انسان نے خود پڑھنا اور سوچنا شروع کر دیا اور یہیں سے ایک جمہوری معاشرے کی بنیاد

۴ ولکنی استعملتھم لیعلموکم کتاب ربکم وسنۃ نبیکم۔ — میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کی سنت کی تعلیم دیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تعلیم کو عام کرنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں اُن کے متعلق مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"تمام ممالک مفتوحہ میں ہر جگہ قرآن کا درس جاری کیا اور معلم و قاری مقرر کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ چنانچہ یہ امر بھی حضرت عمرؓ کے اولیات میں شمار کیا جاتا ہے کہ انہوں نے معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم جبری طور پر جاری کی۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابو سفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن پاک کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اس کو سزا دے۔ حکایت ہیں لکھنا بھی سکھایا جاتا۔ عام طور پر تمام اضلاع میں احکام پر بھیج دیئے گئے تھے کہ بچوں کو شہسواری اور کتابت کی تعلیم دی جائے۔" (الفاروق) (مترجم)

لہ مغرب کے نظام تھیاکریسی (مذہبی ریاست) کو جس چیز نے سب سے زیادہ غذا مہیا کی وہ عوام کی جہالت تھی اسی سے مذہبی طبقوں کی سطوت و خدائی قائم ہوئی۔ اس لیے انھوں نے پوری کوشش کی کہ لوگوں کے لیے علم دین اور اس کے حصول کو صرف اپنے تک ہی محدود رکھا جائے اور باقی لوگوں کے لیے اس کی حیثیت شجرِ ممنوعہ کی سی ہو تاکہ کہیں عوام الناس خود ہی تعلیمات الٰہی پر غور کرنے کی "غلطی" نہ کر بیٹھیں اور اس طرح ان کی عیاریوں کا پردہ چاک ہو جائے۔ اس کے برعکس اسلام نے علم کو چند لوگوں کی میراث بنا کر نہیں رکھا۔ اس نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ہر شخص بذاتِ خود تعلیمات الٰہی پر غور کرے اور اس طرح طالب و مطلوب کے درمیان وہ پردے جو بعض خود غرض انسانوں نے حائل کر رکھے تھے، خود بخود تار تار ہو گئے۔ اسلام نے ہر فرد کو موقع دیا کہ وہ حق کو

پڑی۔ جہاں ہر فرد کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل تھے۔ پڑھنے لکھنے اور تعلیم کے متعلق اسلام کے اس نظریہ کا یہ اثر تھا کہ ساری اسلامی دنیا میں تلاش و جستجو کا شوق بہت تیزی سے پھیل گیا اور بعد میں اس نے یورپ کو بھی اس راہ پہ ڈال دیا۔ اسلام نے نہ صرف علم کو ایک مقدس شے قرار دیا بلکہ عوام الناس کے دلوں میں اس کی پیاس بھی پیدا کی اور یہی چیز آخر کار جدید سائنسی دور کی نقیب ثابت ہوئی[1]۔

۲۔ خود دیکھے اس کی آیات پر غور و فکر کرے اور وجدان سے کام لے کہ زندگی کے مسائل کو سمجھے۔ اسلام کے اس طرز فکر نے اسلامی معاشرہ کو جمہوری سانچوں میں ڈھال دیا ہے

یہودیوں کے عہد عروج میں احکام الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ بلنچلی نے اپنی کتاب نظریہ ریاست میں جو بیان کیا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہودیوں کے علماء علم پر کس طرح اپنی اجارہ داری قائم کر کے عوام کو دھوکہ دیتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

"خدا کا قانون ایک تابوت کے اندر رکھا ہوا تھا جس پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اس کے اوپر زریں عرش رحمت تھا۔ دو کروبیاں اس کی حفاظت کرتے تھے اور الہامات ربانی کے مقام کے طور پر لوگ اُسے مقدس سمجھتے تھے۔ تابوت اور عرش رحمت دونوں مقام اقدس کے اندر قبۃ العہد میں ایک پردے کے پیچھے رکھے ہوئے تھے اور یہ قبہ گویا خدا کی قیام گاہ سمجھا جاتا تھا اور احبار نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے تھے یہیں پر کاہن اعظم یاوے کے احکام حاصل کرتا اور انہیں لوگوں کو سناتا تھا۔"

[1] یہ چیز ایک اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس کا یورپ کے بڑے بڑے اساتذہ تک نے اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر گستاؤ لیبون اپنی کتاب "تمدن عرب" میں اس مسئلہ کی نسبت یوں رقمطراز ہے۔

"عربوں کے اندلس میں دسویں صدی میں ہونے کی بدولت یورپ کے ایک گوشہ میں علم و ادب کا وہ چرچا باقی رہا جو ہر جگہ یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں بھی متروک ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بجز عربی سرزمین اندلس کے اور کوئی مقام نہ تھا جہاں علوم کی تحصیل کرنا ممکن ہو اور یہیں وہ خاص اور محدود اشخاص، جن کو علم کا شوق تھا تحصیل کے لیے آتے تھے۔ ایک اختلافی روایت کی رو سے جس کا غلط نہ ہو

اب ہم سائنس کی دوسری خصوصیت کی طرف توجہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کا سائنسی طریق کار

۲ - ہونا اب تک ثابت نہیں ہوا - گربرت نے جو ۹۹۹ء میں سلوسٹر دوم کے نام سے پوپ بن گیا، یہیں علم حاصل کیا تھا جس وقت اس نے اپنے علم کو یورپ میں اشاعت دینا چاہا تو وہ اہل یورپ کو اس قدر خلافِ فطرت معلوم ہوا کہ انہوں نے اس پر شیطان کے مسلط ہونے کا الزام لگایا پندرھویں صدی تک کسی ایسے مصنف کا حوالہ نہ دیا جاتا تھا جس نے محض عربوں سے نقل نہ کیا ہو - راجر بیکن پیا کا لیونارڈو ویلی نوکا آرنولڈ پال سنٹ ٹامس، البرٹ بزرگ قسطیلیہ کا الفانسو دہم یہ سب یا تو عربوں کے شاگرد تھے یا ان کی تصنیفات کے نقل کرنے والے - ان ہی عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر علی الخصوص علمی کتابوں پر پانچ چھ صدی تک یورپ کے کل دار العلوموں کی تعلیم کا دارومدار رہا بعض علوم میں مثلاً طب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا تسلط خود ہمارے زمانے تک موجود ہے۔

حاشیہ مثلہ اس ضمن میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم نے انفس و آفاق پر غور کرنے کی دعوت دی ہے مگر اس سے اس کا مقصد خالق کائنات کی معرفت ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ گو مسلمانوں نے تجربہ اور مشاہدہ سے کلیات اخذ کر کے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی مگر وہ اس راہ کے کانٹوں سے پوری طرح دامن بچا کر نکل گئے۔ استقرائی منطق اور تجربہ اور مشاہدہ اکثر اوقات انسان کو مادی دنیا کے "خم و پیچ" میں الجھا دیتا ہے اور اس طرح حقیقت تک پہنچنے میں اسے کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ پھر اس کے ذریعہ انسان کے اندر ایک غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ بسا اوقات وحی والہام کی ضرورت کا انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ یورپ کو اسی طریق استدلال نے مادیت کے بے حس شکنجوں میں جکڑ دیا ہے۔ مسلمان حکماء نے اس طرز تفکر سے بالکل ایک دوسری طرح کا کام لیا ہے۔ اس عالم رنگ کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان کی نظر کو فریب نہ دے سکیں۔ انھوں نے اس کائنات کے پس پردہ جھانک کر حقیقت کبریٰ کا کھوج لگایا۔ اس وجہ سے انھوں نے مادی زندگی سے پورا فائدہ اٹھا کر بھی اس کی مبالغہ آمیز قدر و قیمت سے احتراز کیا اور انسان کو فطرت کا تابع بنانے کی بجائے فطرت کا مسخر کرنے والا قرار دیا۔ پھر انہوں نے مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے انسان کو یہ بتایا کہ ان کی کچھ حدود و قیود ہیں جن کو نظرانداز کرنا اس کے لیے

کے متعلق کیا نظریہ ہے۔ انسانی معاشرے کے ابتدائی دور میں انسان ہر شے کی قدر و قیمت کا تعین سطحی اور سرسری مشاہدے کی بنا پر کرتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا شعور انسانی نے ترقی کی اور انسان نے اپنے تجربات کو علم کی اساس بنایا۔ مگر ابھی تک اس کا علم حالات و واقعات کی محض ایک فہرست تھی اور وہ اس قابل نہ ہوا تھا کہ مقدمات کو ترتیب دے کر نتائج اخذ کرے یا حال کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھ سکے۔ اس کا علم محدود، ناقص اور بے ترتیب تھا۔ استقراء و قیاس کا دور یونانی فلاسفہ کے عہد میں آیا مگر وہ اس معاملے میں حد سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے اپنا سارا زور تعقل اور تفکر پر دیا اور مشاہدے اور تجربے کو قریب قریب نظر انداز کر گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ایک فلسفی گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر محض غور و فکر

۴۔ سمت مہلک ہے۔ اسی طرح انھوں نے عقل سے پوری مدد حاصل کی مگر اس کی غیر مشروط راہنمائی کو قبول نہ کیا بلکہ خود عقل کو بھی اس راز سے آشنا کیا کہ زندگی کے کونسے گوشے اس کی رسائی سے باہر ہیں اور اس طرح انھوں نے حیاتِ انسانی میں وحی و الہام کی ضرورت کو نہایت واضح طور پر ثابت کیا۔ مذہب سائنس کا مخالف نہیں بلکہ اس کا مؤید اور داعی ہے۔ یہ دونوں روشنی کی دو ایسی کرنیں ہیں جو ایک ہی شعلہ سے نکلی ہیں۔ ایک خدا کا کلام ہے اور دوسرا خدا کا کام۔ دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔

اسی سلسلہ میں دوسری بات جو ذہن میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ سائنس میں اگرچہ مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت اصول کے مقابلہ میں زیادہ ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصول و قوانین کی سائنس میں کوئی وقعت ہی نہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ جس نسبت سے سائنس اس مادی دنیا کی طرف بڑھتی ہے اسی تناسب سے اس میں استقرائی طریق فکر غالب ہوتا چلا جاتا ہے۔ سائنس دانوں میں بھی بے شمار لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جنہوں نے استخراجی طریقِ استدلال اختیار کیا۔ اس کی ایک واضح مثال ہمیں اقلیدس میں ملتی ہے ممکن ہے اقلیدس کے بعض اصول تجربات سے اخذ کیے گئے ہوں مگر ہر شخص جس نے ان کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ عالم اپنے دلائل کی تصدیق کے لیے تجربات پر اعتماد نہیں کرتا۔ اقلیدسی ہندسہ استخراجی منطق کی بڑی ہی اچھی مثال پیش کرتا ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سائنس اور فلسفہ دو مختلف علوم نہیں بلکہ ایک ہی علم کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ان کی سرحدیں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے

جدا کرنا کافی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ (مترجم)

کے ذریعہ کائنات کے بارے میں کلی اور قطعی علم حاصل کر سکتا ہے اگر مظاہرِ قدرت میں کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جو ان کے وضع کیے ہوئے اصولوں سے قدرے مختلف ہوتا تو یونانی فوراً یہ کہہ دیتے کہ قصور قدرت کا ہے فلاسفہ کا نہیں۔ سقراط اور افلاطون مشاہدات کو بنظرِ استخفاف دیکھتے کیونکہ ان کے نزدیک حواس صرف ایک سطحی سی رائے تو دے سکتے ہیں مگر اُن کو کسی حقیقی علم کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

اس کے برعکس قرآن حکیم نے مستقل طور پر انسان کی توجہ عقل اور تجربہ دونوں کی طرف مبذول کرائی ہے اور اس طرح سب سے پہلے یہ بات ثابت کی ہے کہ سائنس کی بنیاد تجربات و نظریات دونوں پر ہے معرفتِ حق کے مشاہداتی پہلو پر قرآن میں جابجا زور دیا گیا ہے ہم اپنے استدلال کی تائید میں ان میں سے چند آیات پیش کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲:۱۶۴)

جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں۔ نشانیاں ہیں

ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں

میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

قرآن بار بار اس پر زور دیتا ہے کہ گھومو پھرو اور کائنات کی ایک ایک چیز کا مطالعہ کرو اور اس کی حکمت پر غور و فکر کرو۔

اُنْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا ہے۔
اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ۔ اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہو۔ کیا یہ سوچتے نہیں۔ کیا یہ اس میں تدبر و تفکر نہیں کرتے۔

یہی بات ہے جسے قرآن بار بار مختلف انداز میں کہتا ہے۔ ایک اور آیت۔ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ میں ہدایت کی جاتی ہے کہ حیوانات کی خلقت پر غور کرو اور زمین و آسمان کی ہیئات طبیعی کا مشاہدہ کرو۔

علامہ اقبال نے اپنے پہلے خطبہ میں اس نکتہ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس کا مختصر سا اقتباس یہاں پیش کر دیا جائے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید اپنے متبعین میں حقیقت نفس الامری کا احترام پیدا کرتا ہے اور اسی چیز نے آگے چل کر انہیں جدید سائنس کا موسس بنایا۔ ایک ایسے دور میں جبکہ معرفت الٰہی کے لیے مشاہدات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ مشاہدات و تجربات کے ذریعہ عرفانِ حق پیدا کیا جائے۔ (خطبات ص۱۴)

مغربی مورخین بھی اب یہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ غور و فکر کا موجودہ عقلی اور سائنٹفک طریقہ اسلام نے سکھایا۔ بریفالٹ اپنی کتاب "تعمیر انسانیت" میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔

تجرباتی طریقوں سے روشناس کرانے والے نہ روجر بیکن ہیں اور نہ ہی ان کے ہم نام دوسرے۔ بیکن روجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس نے مسلمانوں کی تحقیقات و سائنٹفک تجربات سے

یورپ کی مسیحی دنیا کو روشناس کرایا۔ عربوں کا طریقۂ تحقیق بیکن کے عہد میں بڑی سرعت کے ساتھ یورپ میں مقبول ہوا۔ (از برفالٹ ص۲۰۱)

یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس نے اسلامی تہذیب کے نمایاں اثرات سے جلا نہ پائی ہو بالخصوص علم فطرت اور تجرباتی روح میں کارفرما قوت تو سراسر اسلام ہی کی رہین منت ہے" ص۱۹۱

قرآن مجید کی بے شمار آیات جن میں سے چند کا ہم حوالہ بھی دے چکے ہیں اور متعدد مشرقی اور مغربی اہل فکر حضرات کی تحریریں یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جدید سائنس کی بنا اسلام نے ڈالی ہے۔ تحریک کے نئے نئے طریقے اور تحقیق و تجسس کا ایک بالکل نیا انداز جس پر جدید سائنس کی بنیاد قائم ہے، ان لوگوں کے عطا کردہ ہیں جو اسلام کی تعلیمات پر ایمان لائے تھے۔

اب ہم سائنس کی تیسری خصوصیت کو لیتے ہیں یعنی انسانی معاملات میں اس کی اہمیت اور اس کا حصہ۔ یہاں پھر اسلام کے نکتۂ نظر کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قبل اسلام کے حالات کو نظر میں رکھ کر اس کا جائزہ لیا جائے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اسلام سے قبل جتنے مذاہب بھی آئے انھوں نے اپنے متبعین کو ترک دنیا کی تعلیم دی اور اپنی ساری توجہات حیات بعد الموت پر مرکوز کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے نزدیک دنیوی راحتیں اخروی سعادت کے حصول میں رکاوٹ تھیں۔ ان مذاہب کے متبعین کی نظر میں راہب، یوگی اور لاما بنے بغیر نجات ممکن نہ تھی۔ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر معرفت الٰہی کے لیے جنگلوں اور صحراؤں کا رخ کرتے۔ اس دنیا بیزاری میں جس میں اس زندگی کے سارے متعلقات کے ساتھ تغافل برتا جاتا، یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ طبیعی علوم کے حصول کی طرف متوجہ ہوتے۔

اسلام نے لارھبانیۃ فی الاسلام کا نعرہ بلند کر کے اس غلط اندازِ فکر کو بالکل بدل کر اعتدال کی راہ دکھائی۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ یہ دنیا اور اس کے وسائل اور اس کی نعمتیں اس لیے ہیں کہ ان کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے لیکن دنیا اور اس کے دھندوں میں اتنی مشغولیت بھی صحیح نہیں کہ آدمی عاقبت کی فکر سے غافل ہو جائے۔

قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ سکھاتا ہے کہ وہ علم کو عرفانِ حق کے لیے نہایت ضروری سمجھتے تھے آپ نے فرمایا: العلم سلاحی (علم میرا ہتھیار ہے)۔

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مقولہ کہ علم ہی اصل طاقت ہے، مغرب سے درآمد ہوا ہے انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تصور نہایت وضاحت کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب ساری دنیا جہالت اور اوہام میں مبتلا تھی۔ قرآن نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ علم چاہے کہیں بھی ہو ایک دولت ہے اور عزت و سربلندی کا منصب انہی کو نصیب ہوتا ہے جو اس نعمتِ علم سے سرفراز ہیں۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل دعا یہ تھی کہ ربِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ اے میرے رب مجھے علم میں فراوانی عطا فرما۔ قرآن بار بار اپنے ماننے والوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ حصولِ علم کے لیے ہر دم مصروفِ سعی رہیں اور اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو علم حاصل کرنے میں صرف کریں۔ فرشتوں (دوسری مخلوقات کا تو ذکر ہی کیا) پر انسانی شرف کی وجہ بھی یہی بتائی گئی کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم اشیاء عطا فرمایا ہے وہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی	اور جس وقت آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا
الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ	کہ میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا تو فرشتے کہنے
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ	لگے کہ کیا آپ اس زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ	والے ہیں جو یہاں فساد اور خونریزیاں کریگا حالانکہ ہم
اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ	تیری حمد کے ساتھ تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔
كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں
اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔	جانتے۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا	نام سکھائے، پھر انھوں نے فرشتوں کے سامنے

ے علم واقعی حیات انسانی کے لیے بڑا ہی مفید اور کار آمد ہے اور اسلام نے اس کے حصول پر بڑا زور دیا ہے مگر اس ؂

إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔ قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ
(البقرۃ - ۳۰ - ۳۱)

بیشک کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ انھوں نے عرض کیا کہ نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے حقیقت میں سب کچھ جاننے والا آپ کے سوا کوئی نہیں پھر اللہ نے آدم سے کہا تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نہ صرف جدید سائنس کی بنیادی خصوصیات و اساسی نظریات کی تائید کرتا اور اس کو تقویت بخشتا ہے۔ بلکہ اسلام ہی نے اس کو وجود بخشا اور اس کی یہاں تک

... حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اسلام جس علم پر زور دیتا ہے وہ معرفتِ الٰہی ہے۔ اسلام کے نزدیک وہ علم بالکل بیکار بلکہ مضرت رساں ہے جس میں انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا داعیہ موجود [illegible] بے معنی بحثیں، مجنونانہ [illegible] تھیوریں جن کا سر نہ پاؤں، اسلام میں بالکل کوئی اہمیت نہیں رکھتیں [illegible] طالب علم [illegible] انہیں حقائق سے دور کر دیتی ہے، وہ تعلیم نہیں بلکہ [illegible] کائنات نے ایسے علم سے بچنے کے لیے دعا فرمائی ہے:

اللھم انی اعوذ بك من العلم لا ینفع

اے اللہ [illegible] پناہ مانگتا ہوں جو فائدہ مند نہ ہو۔

قرآن حکیم نے بھی اس طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا۔

جن لوگوں کو [illegible] پر تورات رکھی گئی تھی پھر انھوں نے اس کی ذمہ داریوں کو نہیں اٹھایا ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے۔

رہنمائی کی بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ تہذیب دنیا نے سائنس اور علم کے بارے میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اس کا ماخذ اسلامی تعلیمات ہی ہیں۔ اس دعوے کی تائید کے لیے یہ بات کافی ہے کہ پیروان اسلام نے اپنی تمام تر مساعی حصولِ علم میں صرف کر ڈالیں اور ظہور اسلام کے تھوڑے ہی عرصے بعد مسلمانوں نے صرف سیاسی میدان ہی میں سیادت و فرمانروائی حاصل نہیں کی بلکہ علم و تحقیق کے میدان میں بھی اپنی برتری اور تفوق کا سکہ بٹھایا اور صدیوں تک وہ اس میدان میں بھی دنیا کے امام و رہنما رہے۔

اسلامی انقلاب کا اثر جاہلی معاشرے پر

(از جناب حبیب احمد صاحب)

کتنا عظیم الشان تھا وہ انقلاب، جو فتحِ مکہ کے بعد — پندرہ برس کے اندر اندر — تمام جزیرۃ العرب میں برپا ہو گیا، اس کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اگر آپ یہ کہیں کہ اسے انقلاب سے بڑھ کے کوئی نام دینا چاہیے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ یہ ایک نئی تہذیب تھی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مختصر زمانے میں عرب بُت پرستی سے نکل کر اسلام کی طرف آئے اور ان کی قبائلی ناانصافی اور قومی نفرت ایک ایسی وحدت میں بدل گئی جو ہمہ گیر سیاست اور مشترک غرض کے بل پر قائم تھی۔ اس سے پہلے وہ جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں سمٹے ہوئے تھے اور اس کے بعد یہ ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے جس میں رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں تحلیل ہو گئی تھیں، پہلے ان کی اکثر بادیوں پر بدویت کی سختی و تنگ دستی چھائی ہوئی تھی اور اب وہ ایک ایسی آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے جو اس سے پہلے ان کے لیے اجنبی تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں، اگر ان کی اجتماعی زندگی ان برق رفتار ریلیوں سے متاثر ہو جاتی اور زندگی اور مطالب زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل جاتا۔

اور تھا بھی یہی۔ وہ تمام محرکات جنھوں نے عربوں میں اس نئی تہذیب کو جنم دیا، ان کی انفرادی اور جماعتی دونوں زندگیوں پر اپنا اپنا اثر پہلے سے کسی حد تک رکھتے تھے۔ مذہبی محرک کا اپنا اثر، سیاسی محرک کا اپنا اثر اور اقتصادی محرک کا اپنا اثر۔ یہ اثرات بعض اوقات متناقض ہوتے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر آپس میں گھل مل گئے اور انہوں نے اجتماعی زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اس کا جو اثر بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر مترتب ہوا وہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا اور دماغ کو اپنے متعلق سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس انقلاب کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہم عربوں کی اسلام سے پہلے

کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں۔ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ شہری آبادی بہت ہی کم تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں باقاعدہ بہنے والی نہریں نہ تھیں اور نہ وہاں سال بہ سال وہ موسمی بارشیں ہوتی تھیں جو زمین کو سرسبز و زرخیز بناتی ہیں۔ چند علاقوں کو چھوڑ کے پورے جزیرۃ العرب میں کھیتی باڑی کا کوئی نظام نہ تھا، پھر شہر اور بستیاں ان مقامات پر آباد تھیں جہاں چشموں کی بہتات ہوتی تھی۔ باقی جو کچھ تھا، ریگستان ہی ریگستان تھا، جہاں بارشیں ہوتیں سبزہ اُگ آتا، ورنہ زمین بے آب و گیاہ رہتی۔ اس لیے یمن کے ریگزار بھی دوسرے ریگ زاروں کی طرح اہلِ یمن کے ایک بڑے حصے کو شامل تھے۔ البتہ نجد، حجاز اور عرب کے دوسرے تمام علاقوں میں شہری اور صحرائی آبادی کا جو تناسب تھا، اسی کے لحاظ سے یمن کی شہری آبادی اس کی صحرائی آبادی سے زیادہ تھی۔

ریگستان میں اجتماعی زندگی کی اساس قبیلہ تھا۔ قبیلہ خاندانوں سے ترکیب پاتا تھا، اور خاندان افراد کے نسبی اور قرابتی تعلقات سے وجود میں آتے تھے۔ خاندان کا ہر گھر ندے کے خیمے میں رہتا تھا تاکہ جب کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ اور اپنے بال بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں کوچ کرنا چاہے، تو اسے اٹھا کر لے جانے میں سہولت رہے۔ قبیلے اکثر گرمی اور بہار کے موسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ سبب ریگستان کے چھوٹے چھوٹے چشموں کے گرد گھاس کثرت سے اُگ آتی تھی۔ لیکن موسمِ سرما کی آمد پر چراگاہیں خشک ہو جاتی تھیں تو یہ لوگ شہروں کا رُخ کرتے تھے اور ان کے قریب ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ پیٹ بھر [illegible] حاصل کرنے کے لیے وہ اہلِ شہر کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، یا ان پر چھاپے مارتے تھے، اس لیے کہ ان کی کفیل وہ آزادی تھی جو انہیں اچھے سے اچھے کھانے اور بہتر سے بہتر کپڑے سے زیادہ عزیز تھی۔

یہ ہے بدوی زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کا مختصر سا خاکہ، جس میں بحیثیت مجموعی عرب کی شہری زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کی تصویر بھی شامل ہے اس لیے کہ شہروں کے رہنے والے بھی بدویوں کی طرح قبیلوں ہی میں منقسم تھے اور ان میں سے اکثر بدوی الاصل تھے جن کے دلوں میں شہری زندگی کا شوق پیدا ہوا اور وہ شہروں میں آ کے وہ بس گئے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد شاید آپ آج بھی ان بدویوں میں جنھیں ہنوز تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی، اس نظام کے بچے کھچے آثار کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اگرچہ اسلام نے

بہت کچھ اسے مٹا دیا تھا۔

عرب کے بدویوں اور شہریوں کا خاندانی اور گھریلو نظام آپس میں ملتا جلتا تھا لیکن زندگی کے سروسامان اور اس چیز میں، جسے آج ہم "اقتصادی نظام" سے موسوم کرتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اہل شہر اپنی زندگی تجارت اور اپنے ان باغوں، تاکستانوں اور کھیتوں کی پیداوار کے سہارے بسر کرتے تھے، جن میں بونے، جوتنے اور دیکھ بھال کے کام وہ کرایہ کے آدمیوں سے لیتے تھے۔ اور اپنی اس تجارت و زراعت سے انہیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر اپنا روپیہ سود پر چلاتے تھے، اور جو لوگ کاروبار وغیرہ کرنا چاہتے تھے، انہیں بھاری منافع پر قرض دے کر اپنی رقم تھوڑی سی مدت میں دوگنی کر لیتے تھے۔ یہ سب لوگ زندگی کی ان راحتوں اور آسائشوں میں کھیلتے تھے جن سے اہل بادیہ واقف بھی نہ تھے شراب موسیقی اور جوا ان کے لیے دن رات کا مشغلہ تھا اور خواہشوں کی شکم سیری نے زندگی کو ان کی نظر میں محبوب اور اطمینان افزا بنا دیا تھا۔ تجارت اور سود سے جو بے شمار نفع انہیں ہوتا تھا اس کی وجہ سے وہ لذتوں میں ڈوب گئے تھے اور بلند اخلاق کی بہت سی خوبیاں ان کی کتاب زیست سے محو ہو گئی تھیں۔

لیکن خانہ بدوشی کی زندگی چراگاہوں کی تلاش اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے ترکیب پاتی تھی۔ ایک بدوی کی ملکیت نمدے کا ایک خیمہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یا وہ غلہ اور پھل جو اپنے گرد و پیش کی زمین میں وہ بوتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ ملکیت اس کا ہے جو اسے بوتے۔ لیکن یہ ملکیت برائے نام ہوتی تھی۔ اس لیے کہ بدوی زراعت کو پسند نہ کرتے تھے اور کھیتی باڑی کو اپنے مرتبے سے کم تر سمجھتے تھے، لیکن قبیلے کی آبادی کے اردگرد جو چراگاہ ہوتی تھی وہ قبیلے کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال اس گھاس کا تھا جو ریگستانی آبادی کی ان محفوظ چراگاہوں میں پیدا ہوتی تھی اور ہمسایہ قبائل کو یہ حق حاصل تھا کہ باہمی مفاد کے پیش نظر ایک قبیلہ اپنی زمین کا تبادلہ دوسرے قبیلے کی زمین سے کرے۔

قبائلی بستیوں کی حد بندی آپس کے اتفاق اور رواجی یکسانی سے ہوتی تھی۔ اور جب کوئی قبیلہ چراگاہ کی تلاش میں نکلتا تھا تو کسی دوسرے قبیلے کے لیے جائز نہ تھا کہ اس کی جگہ آباد ہو جائے یا اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے عورت غرابہ کرے۔ لیکن اس قسم کی دراز دستیاں عام تھیں اور ان کے نتیجے میں قبائل کی باہمی پیکار

کوئی انوکھی بات نہ تھی اس لیے ایک بدوی پیدائشی طور پر شمشیر آزما اور قبائل کی زندگی اکثر اوقات مار دھاڑ اور چھینا جھپٹی کی زندگی ہوتی تھی۔

حملہ و انتقام کے خوف کا یہ فطری اثر تھا کہ وہ قبیلے کی یک جہتی میں اضافہ کر دیتا اور اس یک جہتی کی مزید تقویت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ماضی کی یادوں اور اپنے اسلاف کے جرأت آموز اور شجاعت انگیز کارناموں کے طلسم زار میں پہنچا دیتا۔ اور یہی راز تھا عربوں کی اپنے نسب سے غیر معمولی دلچسپی کا کہ اس کے ذریعے وہ دوسروں پر اپنی بڑائی جتائیں، اپنی یک جہتی کو تقویت دیں اور اپنے اسلاف کی بلندیوں تک پہنچیں جو شجاعت، سخاوت، پناہ گیر کی حمایت اور اسی قسم کی ان دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے، جن کا بیج بدوی زندگی نے ان کی فطرت میں بویا تھا اور جو ان کی سیرت و کردار کا ایک مستقل جزو تھیں۔ اور اخلاق کا یہ فرض تھا کہ ان خوبیوں سے اپنے اسلاف کی تقلید کریں کہ صرف انہی خوبیوں کے سہارے وہ بدوی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایک بدوی ہمیشہ دوسروں کے حملے کی زد میں رہتا تھا اور بدویانہ زندگی عسرت و تنگ دستی کی زندگی تھی جو کبھی کبھی فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ بادیہ شریف و سخی نہ ہوتے، مہمانوں کی مدارات اور پڑوسیوں کی حمایت نہ کر سکتے، تو ان میں سے اکثر ہلاک ہو جاتے۔ پھر صحرا کی زندگی خطرات پر غالب آنے اور حملہ آوروں کو شمشیر بشمشیر جواب دینے کی زندگی تھی، اس لیے اگر اہلِ صحرا بہادر، زیرک اور توانا نہ ہوتے تو زندگی کا بوجھ انہیں کچل ڈالتا۔ اور اگر ان میں مدافعت کی وہ صلاحیت نہ ہوتی، جو دوسروں کو ان سے خوفزدہ کر دیتی تو انہیں شر و فساد میں مبتلا ہو جانا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ فخر و شجاعت اور سخاوت و مکارم کے ذکر پر مشتمل ہے اور ان میں ان مختلف فضیلتوں کا بیان پایا جاتا ہے جو خانہ بدوشی کی زندگی کا لازمہ تھیں، اور جو اہلِ صحرا کو اپنے اعادہ و تکرار پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکتے تھے جو ان کی بستیوں پر حملہ آور ہوں بلکہ جان و مال، عزت و ناموس غرض یہ کہ ہر قدر کو ٹھیس لگنے پر بھڑک اٹھنا ان کا عام دستور تھا۔ قبیلہ اپنے ہر فرد کا انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ جو لڑائیاں عزت و ناموس کے انتقام میں شروع ہوتیں ان کی آگ برسوں تک سلگتی رہتی۔ اگر کوئی قبیلہ بطورِ خود انتقام لینے کے قابل نہ ہوتا تو وہ اپنے حلیف یا ہمسایہ قبائل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس قسم کے

معاہدے عرب میں عام تھے اور ان معاہدوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حلیف قبیلے مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک تلوار نیام میں نہ رکھیں گے جب تک مظلوم اپنا حق نہ پالے۔

ان کے ہر قبیلے بلکہ ہر گھر کا ایک الگ بت تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن بتوں کو پوجتے وقت وہ اللہ کے وجود سے انکار نہ کرتے تھے بلکہ انہیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ حج کعبہ کے وقت لبیک کہتے ہوئے اللہ کا نام لیتے اور ان بتوں کا اس کے شریک کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے۔ بعض قبائل کہتے: "حاضر ہوں، یا اللہ! میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس کے جو تیرا شریک ہے۔ تو اس کا اور دوسری چیزوں کا مالک ہے" قریش کعبے کا طواف کرتے اور کہتے: "قسم ہے لات و عزیٰ اور تیسرے منات کی۔ یہ اعلیٰ غرانیق ہیں اور ان کی شفاعت قابلِ اعتماد ہے۔" قرآن کہتا ہے

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ۔

یہ ہے اسلام سے پہلے عربوں کی اجتماعی زندگی کے عقائد و عادات کی اجمالی تصویر، جسے دیکھ کر آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے کن کن چیزوں کو مٹایا۔ فطری طور پر شرک ہی تھا جس کا اثر سب سے پہلے عربی ذہن سے محو ہوا۔ عربوں نے شرک کے متعلق وہ آیات سنیں جنہوں نے قبول اسلام کے بعد انہیں شرک کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جن لوگوں نے راہِ ارتداد اختیار کی، یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انہوں نے بھی کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرایا، بلکہ ہر جھوٹے نبی نے یہی اعلان کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے نبی تھے اور وہ اپنی قوم کا نبی ہے۔ اور جب ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو سارا عرب لا الٰہ الا اللہ وانّ محمداً رسول اللہ پر ایمان لے آیا۔

شرک کے اس خاتمے کا عربوں کے ذہن اور ان کی اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اب مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی آقا نہ تھا۔ بلکہ ان کی تمام تر عقیدت صرف اللہ جل شانہٗ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان اپنی زندگی کے مسائل میں غیر خدا سے مدد کا طالب نہ ہوتا تھا۔ اب وہ خدا سے لو لگاتے تھے، اسی پر بھروسا کرتے تھے اور اسی سے مدد چاہتے تھے۔ اس سے عربی عقل اور عربی ضمیر پر بت پرستی کی جو بیڑیاں تھیں وہ کٹ گئیں اور یہ دونوں انسان کے لیے ترک و اختیار کی کسوٹی بن کے اس کے اور خدا کے درمیان

تنہا وسیلہ ہو گئے۔

عربی عقل بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ پر ایمان لے آئی، جو ہر چیز کا خالق ہے اور اسے وہم کی غلامی اور ان رسوم کی بندگی سے نجات مل گئی جو اس پر جاہلیت نے فرض کر رکھی تھیں۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا پیغام اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھی۔ عقل کی اس آزادی کا مذہبی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔

آبائی رسم و رواج کے خلاف یہ بغاوت واقعی اپنے اندر اتنی جان رکھتی تھی کہ عربی زندگی میں اساسی طور پر ایک ایسا اجتماعی انقلاب برپا کر دیتی جو بدویت اور مدنیت دونوں کو شامل ہوتا۔ یہ بغاوت وحی کے ذریعے آئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اس لیے وہ اللہ کا ایک حکم تھی، جس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا اور جس کی تعمیل بہرصورت ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ذہن پر اس بغاوت کا اثر اس عقلی بغاوت کے اثر سے زیادہ شدید تھا جس نے بتوں کو ڈھا کر اور شرک سے انکار کر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ جب کبھی عقل و دل غلامی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوئے ہیں، آزادی کے نور سے ضیاء اندوز ہونے کے لیے اسی کی طرف دوڑے ہیں۔ یہی حال ہماری فکر اور ہمارے ذاتی عقائد کا ہے۔ لیکن جہاں زندگی پر ہمارے اختیارات اور دوسروں سے ہمارے تعلقات کا سوال آتا ہے، اطاعت و تسلیم کی ڈوری میں تردد اور ہچکچاہٹ کی گرہیں پڑنے لگتی ہیں اور عقل کی سپر اندازی کے باوجود چاہتے ہم یہی ہیں کہ ہمارا اقتدار بہرصورت قائم رہے۔ اور جو کچھ اس میں کمی آگئی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہو جائے، اس لیے کہ ہماری خواہشوں کا تقاضا یہی ہے۔ عقل جتنی چاہے خواہشوں سے بلند ہو جائے اور آزادیٔ فکر جتنا چاہے بلند مقامات پر عبور حاصل کرے، انسان پر حکومت وہی جبلت کرتی ہے جو تمام خواہشوں کا مدار ہے۔

آج کل کی اصطلاح میں جسے "اکتسابی حقوق" سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ دراصل مادی منفعتیں ہیں۔ انسانی فطرت مادی منفعتوں سے غیر معمولی تعلق رکھتی ہے اور باقی تمام چیزوں سے زیادہ ان سے چمٹی رہتی ہے۔

قرآن جو اقتصادی انقلاب لے کر آیا تھا۔ اس کا اثر اجتماعی انقلاب سے کچھ کم نہ تھا۔ دولت مند تاجر اور سردار وغیرہ جنھیں زمانۂ جاہلیت میں امتیازی مقام حاصل تھا، محتاجوں اور مزدوروں سے غرور و تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے، اگرچہ یہ غرور و تکبر ان کی آزادی و خودداری کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا اس لیے مالدار لوگ جب کسی محتاج کو کچھ دیتے تھے تو رس کھا کے دیتے تھے اور پھر احسان جتا جتا کے اپنی عطا و بخشش کو مرتبے کی بلندی کا ذریعہ بناتے تھے۔

اسلام نے نزولِ وحی کے آغاز ہی میں انانیت کے اس جذبے کا مقابلہ کیا۔ لوگوں میں اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی، مال داروں کو اس خیرات پر سرزنش کی جس کے نتیجے میں وہ احسان جتا جتا کے کچھ دیتے تھے اور محتاجوں کے لیے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲: ۲۶۳-۲۶۴)

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ

اور فرمایا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجتمندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

صدقہ مالداروں کا فقیر پر احسان نہیں، بلکہ فقیر کا مال دار کی دولت میں حق ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو۔ نیز گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ : ۶۰) — ہیں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

اور فقیر کا یہ حق مساوی ہے والدین کے اس حق کے، جو ضرورت کے وقت انہیں اپنے بیٹے کے مال میں حاصل ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲ : ۲۱۵) — لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر رشتہ داروں پر یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہو گا۔

یہ ایک نئی تعبیر ہے جس کی اساس پر آپ بآسانی اسلامی نظامِ معیشت کی مکمل عمارت کھڑی کر سکتے ہیں پھر یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اس قسم کی قوت سے عرب پہلے ناآشنا تھے۔ ہر زمانے میں لوگ احسان و عطا کے متعلق یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ دینے والے کا کرم ہے، لینے والے کا حق نہیں۔ لیکن قرآن احسان و عطا کو ایک حق سمجھتا ہے اور صرف یہ حق ہی ہے جو مالدار کی دولت کو گناہ کی آمیزش سے پاک کرتا ہے، اسی لیے شروع شروع اس نغمے کے حیات وار اثر نے اسلام کی اشاعت میں کام کیا اور بعد کو اسلامی جماعت میں وہ برق رفتار تبدیلیاں پیدا کیں جو اسی نظامِ معیشت کا لازمی ثمرہ تھیں۔

سود کے خلاف اسلام نے نہایت شدید جنگ کی، ارشاد الٰہی ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (۲ : ۲۷۶) — اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا — وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ان کا حال اُس شخص کا سا

كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲: ۲۷۵) ہوتا ہے جیسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔

بلکہ قرآن نے سود کو لوگوں کے مال ناجائز طریقوں پر کھانے سے تعبیر کیا:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴: ۱۶۱) اور وہ سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں سود کا جو رواج تھا اللہ نے اسے حرام قرار دے دیا اور تاکید فرما دی کہ جو شرائط پہلے طے پائی تھیں ان کے مطابق کوئی شخص ایک حبہ بھی وصول نہ کرے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲: ۲۷۸ و ۲۷۹) اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اصل لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس اقتصادی و معاشی تنظیم کا اجتماعی زندگی پر اس قدر قوی اور گہرا اثر پڑا کہ سود خواری جاہلی معاشرے سے کلیتہً مٹ گئی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی پرجوش تائید نے اپنے معاشرے میں کہیں بھی اور کسی زمانے میں بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری زمانے تک مسلمان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس معاشی مفسدے سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی نظیر اس قدر عظیم، مستحکم، ہمہ گیر اور پائندہ انقلاب کی نہیں ہے۔

رسائل و مسائل

کیا مسلک حنفی میں بعض نشہ آور اشیاء حلال ہیں؟

سوال۔ پچھلے دنوں ایک طالب علم جو کہ ہدایہ اخیرین پڑھتا تھا، ایک مقام سمجھنے کے لیے بندہ کے ہاں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ مطالعہ کر کے پھر سمجھاؤں گا۔ مطالعہ کرنے پر مجھے تسکین نہ ہوئی۔ آپ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو: کتاب الاشربہ ص۴۹۲ ج دوم مطبع مصطفائی سلطانیہ وھو نص علی ان ما یتخذ من الحنطۃ والشعیر والعسل والذُّرۃ حلال عند ابی حنیفۃؒ ولا یحدّ شاربہ وان سکر منہ ولا یقع طلاق السکران منہ بمنزلۃ النائم۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امامنا الاعظم رحمہ اللہ کے ہاں گندم، جو، شہد اور جوار کا جوشاندہ اگر نشہ بھی پیدا کر دے پھر بھی وہ حلال ہے اور اس کے پینے والے پر حد نہیں لگے گی حالانکہ آنحضورصلی اللہ علیہ وسلم (فداہ امی وابی) نے ارشاد فرمایا ہے "کُلُّ مسکر حرام" وحرّم الخمر"، "وکل مسکر خمر" اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اسی بات پر بعض اصحاب الظواہر نے لکھ دیا ہے کہ حنفیوں کے ہاں شراب حلال ہے۔ نعوذ باللہ۔ براہ کرم اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:۔ ہدایہ سے جتنی عبارت آپ نے نقل کی ہے اُس سے بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ عبارت شروع سے یوں ہے: وقال فی الجامع الصغیر وما سوی ذالک من الاشربۃ فلا بأس بہ۔ قالوا ھٰذا الجواب علی ھذا العموم والبیان لا یوجد فی غیرہ وھو نص علی...

گویا جامع صغیر کی اصل عبارت صرف اتنی ہے کہ "(امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک انگور اور کھجور کی شراب یا جوشاندے کے (سوا) دیگر مشروبات کے استعمال میں حرج نہیں"۔ اس کے بعد کی ساری عبارت جس کا ترجمہ

آپ نے کیا ہے امام ابوحنیفہؒ کا قول نہیں ہے، بلکہ بعض دوسرے لوگوں کا اپنا استنباط ہے۔ بالخصوص لا یحد شاربه وان سکر منه کے الفاظ تو اس میں ایسے ہیں جو نہ جامع صغیر میں موجود ہیں اور نہ ہی اس مفہوم اور اس استدلال کی کوئی گنجائش وہاں پائی جاتی ہے۔

ذرا آگے چل کر صاحب ہدایہ لکھتے ہیں وعن محمد انه حرام ویحد شاربه ویقع طلاقه اذا سکر منه کما فی سائر الاشربة المحرمة یعنی امام محمدؒ جو جامع صغیر کے راوی اور مرتب ہیں ان کا قول ہے کہ گیہوں، جو، شہد، چاول وغیرہ سے جو نشہ آور مشروب تیار ہو وہ بھی حرام ہے اور اس کو پی کر جو نشے میں مبتلا ہو گا اس پر بھی حد اسی طرح واجب ہے جس طرح دوسری نشہ آور چیزوں کے پینے پر ہے پھر آگے فرماتے ہیں ونبیذ العسل والتین والحنطة والذرة والشعیر حلال وان لم یطبخ و هذا عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله اذا کان من غیر لهو وطرب . . . وهل یحد فی المتخذ من الحبوب اذا سکر منه قیل لا یحد . . . والاصح انه یحد فانه روی عن محمد فیمن سکر من الاشربة انه یحد من غیر تفصیل وهذا لان الفساق یجتمعون علیه فی زماننا اجتماعهم علی سائر الاشربة بل فوق ذالک ۔ یہاں سے مزید معلوم ہوا کہ نبیذ کی مختلف اقسام بھی امام ابوحنیفہؒ اور ابویوسفؒ کے نزدیک صرف اس صورت میں حلال ہیں جبکہ وہ تفریح و نشاط کی غرض سے نہ پی جائیں (بلکہ کسی ناگزیر حالت میں محض غذا اور توانائی حاصل کرنے کے لیے پی جائیں) نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام محمد مطلقاً نشے کو موجب حد قرار دیتے ہیں اور اس کا اطلاق غلوں سے تیار کردہ نشہ آور جوشاندوں پر بھی اس لیے کرتے ہیں کہ فساق و فجار ان کے گرد کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔

درالمختار میں اس مضمون کی تشریح یہ ملتی ہے:

نبیذ التمر والزبیب ان طبخ ادنی طبخة یحل شربه وان اشتد وهذا اذا شرب منه بلا لهو وطرب، فلو شرب للهو فقلیله وکثیره حرام، ومالم یسکر، فلو شرب ما یغلب علی ظنه ان یسکر فیحرم۔ کھجور کی نبیذ اگر معمولی آنچ دینے سے پک بھی جائے تو اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ اولاً محض سرور و سرخوشی مطلوب نہ ہو، ورنہ اس کی کثیر یا قلیل سب مقدار حرام ہے۔ اور ثانیاً

اُس سے نشہ پیدا نہ ہو، ورنہ ایسی مقدار پینا حرام ہے جس سے سُکر کا ظنِ غالب ہو"!

یہی کچھ کشمش، کھجور، شہد، انجیر، گیہوں، جو وغیرہ کے متعلق کہنے کے بعد پھر لکھا ہے اذا قصد بہ استمراء الطعام والتداوی والتقوی علی طاعۃ اللّٰہ ولو للھو لا یحل اجماعاً یعنی ان کو طبی یا غذائی حاجت کے بغیر محض شوقیہ پینا اجماعاً حرام ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی یہ تشریح کرنے کے بعد آگے لکھا ہے: وحرمھا محمد مطلقاً قلیلھا وکثیرھا وبہ یفتی، وذکرھا الزیلعی وغیرہ واختارہ شارح الوھبانیۃ وذکر انہ مروی عن الکل۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف کا فتویٰ اسی پر ہے کہ اس قسم کے تمام نشہ آور شروبات کی ہر مقدار علی الاطلاق حرام ہے۔

اس ساری بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ یا فقہائے حنفیہ میں سے بعض دیگر اصحاب نے اس بارے میں کوئی تمیز قائم کی بھی ہے تو اس سے پیشِ نظر صرف قطعی الحرمت چیز یعنی خمر، اور اجتہاداً حرام قرار دی جانے والی اشیاء کے درمیان فرق کرنا تھا۔ دوسری قسم کی چیزوں کو وہ اس حد تک حلال قرار دیتے تھے یا قابلِ مواخذہ قرار نہ دیتے تھے جس حد تک وہ باعثِ فساد نہ ہوں۔ یہ صرف ایک قانونی امتیاز تھا جسے وہ واضح کرنا چاہتے تھے، ورنہ یہ بات ان کے پیشِ نظر قطعاً نہ تھی کہ ایک دو قسم کی شرابوں کے سوا دوسری تمام نشہ آور چیزوں کو حلال کر دیں۔ غلط فہمی صرف اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ جامع صغیر کی عبارت کو واضح کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہ نے وہاں سکر منہ کے الفاظ لکھ دیے ہیں۔ ان الفاظ کا ماخذ معلوم نہیں کیا ہے۔ پھر ہدایہ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ قالوا اور قیل کے الفاظ کے ساتھ کن کا مسلک نقل کیا گیا ہے۔

بہر حال امام ابوحنیفہؒ یا مطلقاً احناف کی جانب یہ بات منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف انگور یا کھجور ہی کی شراب کو حرام قرار دیتے تھے اور دیگر مسکرات کی عمومی اور غیر مشروط حلت کے قائل تھے۔

قضائے قاضی کا ظاہری و باطنی نفاذ

سوال: شرح وقایہ ج ۳ باب المرافعہ اور ہدایہ ج ۳ باب کتاب القاضی الی القاضی میں یہ عبارت درج ہے:

وکل شئ قضی بہ القاضی فی الظاھر بتحریمہ فھو فی الباطن کذٰلک عند ابی حنیفة وکذا اذا قضی باحلال۔ لیکن قرآن میں ہے: وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ نیز صحیح بخاری میں ہے: فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انہ صدق ... فانما قطعة من النار۔ اس طرح قرآن و حدیث سے اس قول کی تغلیط ثابت ہو رہی ہے اور یہ قول بالبداہت کتاب و سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے بوادر النوادر میں بھی اس قول کی تائید کی ہے مگر اطمینان نہیں ہوا۔ اس قول کی صحیح توجیہ اگر کوئی ہے تو رقم فرما دیں۔

جواب: آپ نے امام ابوحنیفہؒ کا جو قول نقل کیا ہے بلاشبہ اس کا مفہوم متعین کرنے میں بعض اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی اور بعض دوسرے فقہا نے، حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ کے صاحبین (امام محمد اور امام ابویوسف) نے بھی بعض جزوی تفریعات میں اپنے استاد کے اس کلیے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو امام صاحب کا اصول اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور قابل قبول ہے اور اپنے خاص محل کے لحاظ سے اس کی ایسی تاویل کی جا سکتی ہے جس سے سارے اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں۔ امام صاحب کا قول یہ ہے کہ قاضی کا عدالتی فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتا ہے یعنی جس چیز کو وہ حرام اور ناجائز قرار دیدے وہ حرام قرار پاتی ہے .... اور جس چیز کو وہ حلال اور جائز قرار دے دے وہ حلال قرار پاتی ہے، خواہ جھوٹی شہادت کی بنا پر یہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس قول کا حقیقی مدعا سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو اس بات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے کہ

فقہائے حنفیہ کی بالاتفاق تصریحات کے مطابق یہاں ہر نوع کے مقدمے کا فیصلہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یا تو نکاح و طلاق کے مقدمات ہیں یا پھر خرید و فروخت کے فسخ و انعقاد یا ملکیت سے متعلق ایسے نزاعات ہیں جن میں اثباتِ ملک کا انحصار کسی متعین سبب مثلاً بیع و شراء یا حق وراثت وغیرہ پر ہو۔ دوسری قابل غور اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً کے الفاظ کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اور منشا متعین کیا جائے، کیونکہ اس کے صحیح تعین کے بغیر اصل قول کی صحیح جہت کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔

عدالتی فیصلے کے ظاہراً نافذ ہونے کا مطلب تو بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ قانون کی وساطت سے اس کی تنفیذ ہو جائے گی، فریقین کے حق میں وہ واجب التعمیل اور عامۃ الناس کے نزدیک وہ قابلِ تسلیم ہوگا۔ لیکن فیصلے کے باطنی نفاذ کا مسئلہ ذرا غور طلب اور محتاجِ تفصیل ہے۔ بالخصوص اس حالت میں جبکہ عدالت کا فیصلہ غلط یا ناقص شہادت کی بنا پر باعتبارِ حقیقت صحیح صادر نہ ہوا ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد یہ ہے کہ اس واقعاتی سُقم کے باوجود قاضی کا فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گا۔ باطناً نافذ ہونے کا مفہوم بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ فیصلہ گویا عنداللہ بھی اس طرح نافذ ہو گیا کہ اس غلط فیصلے کی آڑ میں اگر کسی نے اپنے لیے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر لیا تب بھی اس نے کوئی گناہ کیا اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی مواخذہ ہوگا۔ لیکن یہ مفہوم خواہ امام صاحب کے معترضین نے اُن کے قول کو پہنایا ہو خواہ بالفرض اُن کے موافقین نے ایسا کیا ہو، میرے ناقص علم اور گمان کے مطابق یہ تشریح نہ تو خود امام صاحب سے کہیں منقول ہے، نہ یہ صحیح اور قرینِ انصاف ہے اور نہ ہی امام صاحب کے اصل قول سے یہ لازم آتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اپنے قول کی اس تاویل سے قطعاً بری الذمہ ہیں۔ اتنے بڑے اور جلیل القدر دینی پیشوا اور مقتدا کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ججوں کو حلت و حرمت کے خدائی اختیارات ان معنوں میں تفویض کر دیے ہوں گے اور عوام کے اندر سے احساسِ گناہ اور حلال و حرام کی تمیز کو مٹانے کا یہ راستہ کھول دیا ہوگا۔

اگر حقیقتِ حال یہ نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے، تو پھر بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قول کا صحیح منشا کیا ہے۔ میری دانست میں اس کا صحیح منشا اور مدعا جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ دیانتہً اور اُخروی نتائج و عواقب سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر عدالتی فیصلہ جات کے محض دنیوی اثرات اور قانونی نتیجات پر

غور کیا جائے، تب بھی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان فیصلوں کے بعض پہلو صرف ہماری خارجی اور مادی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض پہلو ایسے ہوتے ہیں جو ہماری داخلی زندگی کے نہایت نازک احساسات اور ہمارے خالص شخصی جذبات و تصورات کو مس کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو محض دنیوی نظم اور قانونی اعتبار سے بھی عدالتی فیصلوں کا ایک پہلو ظاہری ہوتا ہے اور ایک پہلو باطنی۔ میرے نزدیک امام ابوحنیفہ کی قائم کردہ ظاہر و باطن کی تقسیم بھی اسی قبیل اور اسی لحاظ سے ہے۔

میں ظاہر و باطن کی اس توجیہ و تعریف کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔ فرض کیجیے کہ زید اور ہندہ کے مابین نکاح کے وجود و عدم کا معاملہ متنازعہ فیہ ہے۔ مان لیجیے کہ حقیقتہً اور فی الاصل تو نکاح موجود ہے لیکن ہندہ اس سے انکاری ہے یا طلاق مغلظہ ہو جانے کی مدعی ہے اور اپنے حق میں جھوٹے گواہ پیش کر دیتی ہے۔ دوسری طرف سے زید کوئی شہادت ثبوتِ نکاح کے لیے نہیں پیش کر سکتا۔ عدالت عدمِ نکاح یا وقوعِ طلاق کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ اب اس فیصلے کا ایک پہلو تو ظاہری ہے جو عالمِ مادیات سے تعلق رکھتا ہے، اور وہ یہ کہ مثلاً اب زید کے ذمے نہ ہندہ کا نان و نفقہ ہے، نہ اس کی سکونت ہے اور نہ ہی وہ ان چیزوں کے مطالبے کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو عالمِ معنویات سے متعلق ہے اور جسے امام صاحب کی تعبیر کے لحاظ سے باطنی پہلو بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلو عصمت کی حلت و حرمت، نکاح اور تعلقِ زناشوئی سے وابستہ ہے۔ ہندہ نے اثبات دعویٰ کے لیے شہادتِ زور کا جس طرح استعمال کیا ہے اس کے گناہِ کبیرہ ہونے اور آخرت میں اس کے مستوجبِ عذاب ہونے کے بارے میں تو قطعاً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے امام ابن الھمام فتح القدیر میں صاف فرماتے ہیں: علی المتعدی بالدعوی الباطلة واثباتھا بالطریق الباطل اثم یالہ من اثم (جو شخص ایک باطل دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور باطل طریق پر اس کے حق میں ثبوت فراہم کرتا ہے، وہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی گناہ ہو نہیں سکتا)۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اُخروی نتائج کے علاوہ یہاں دنیوی اعتبارات کے لحاظ سے بھی حلت و حرمت کے متعدد سوالات ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کا حل کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔

مثلاً یہ کہ زید اور ہندہ کے مابین عدمِ نکاح کے عدالتی اعلان کے بعد (خواہ یہ اعلان واقعاتی لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو) آیا زید ہندہ سے تعلق زناشوئی قائم رکھ سکتا ہے یا نہیں، اگر رکھے تو آیا عدالت اُسے زانی قرار دیکر اُس پر حد جاری کر سکتی ہے یا نہیں، اگر زید ہندہ کی بہن سے شادی کرے تو وہ جمع بین الاختین کا مرتکب ہوگا یا نہیں، آیا ہندہ کسی دوسرے شخص سے اور کوئی دوسرا شخص ہندہ سے قانوناً اور شرعاً مناکحت اور مجامعت کا مجاز ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیوں اور اگر نہیں تو کیوں نہیں، نیز یہ کہ آیا دوسرے شخص سے نکاح کے جواز و عدم کا کوئی اثر اُس سابق نکاح پر پڑ سکتا ہے یا نہیں ؟

زید اور ہندہ کے مابین فسخ نکاح کا عدالتی فیصلہ واقعاتی اعتبار سے غلط ہی سہی، لیکن چونکہ وہ عدالتی فیصلہ ہے، اس لیے اس کا نفاذ کم از کم ظاہری حیثیت میں تو ناگزیر ہے۔ اب اگر فریقین یا عوام الناس میں سے کوئی فرد سرے سے اس فیصلے کی قانونی اور سیاسی تنفیذ ہی کو چیلنج کر دیگا تو نظامِ عدالت بلکہ پورے نظامِ حکومت میں خلفشار برپا ہو جائے گا اور بد نظمی کی ایک ایسی صورت رونما ہو جائے گی جس میں کسی بھی فیصلے، حکم یا قانون کا چلنا محال ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص عدالتی فیصلے کے ظاہری نفاذ کو تو تسلیم کرلے لیکن اس کے باطنی نفاذ کو تسلیم نہ کرے، بلکہ یہی کہتا رہے یا سمجھتا رہے کہ نکاح کے بطلان کا فیصلہ کالعدم اور باعتبار حقیقت بے اثر ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان سوالات کا کیا اطمینان بخش جواب دیگا جن میں سے چند ایک کا ذکر میں نے اوپر کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ اگر وہ شخص خود زید یا ہندہ کے زوج ثانی کی پوزیشن میں ہو تو وہ کونسا ایسا طرزِ عمل اختیار کر سکے گا، جس میں چند در چند اشکالات نہ پیدا ہوں۔

میرے نزدیک ان تمام الجھنوں کا قطعی حل اور نزاعات کے خاتمے کی آخری شکل یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کیا جائے اور عدالت کے فیصلے کو ظاہراً و باطناً نافذ خیال کیا جائے۔ اس کے بعد ہم پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہہ سکیں گے کہ ہندہ کا تعلق زوجیت اب بہرحال زید سے منقطع ہے اور دوسرے شخص کے ساتھ اس کا نکاح بہرحال جائز ہے۔ ہندہ نے اگر گناہ کیا ہے تو اس کا خمیازہ وہ خود عاقبت میں بھگتے گی۔ امام صاحب کے قول سے اُس کے گناہ میں یا اس کی اُخروی

سزا میں کوئی تخفیف ثابت نہیں ہوتی۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی جو تاویل و توجیہ میں نے کی ہے، اس کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ مسلک بہت محکم اور معقول ہے۔ اس میں بڑی حکمتیں اور مصالح مضمر ہیں۔ اس سے احکام و قوانین شرعیہ کے عملی انطباق میں بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں اور کتاب و سنت کی کسی نص یا کسی اصول سے اس کا تعارض ثابت نہیں ہوتا بلکہ حضرت علیؓ کے ایک فیصلے سے تو اس مسلک کی مزید تائید ہوتی ہے۔ وہ فیصلہ یہ ہے کہ ایک عورت کے خلاف ایک مرد نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ میری بیوی ہے اور اپنے حق میں گواہ بھی پیش کر دیئے۔ حضرت علیؓ نے شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے مرد کے دعوے کو صحیح تسلیم کیا اور اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عورت نے عرض کیا کہ میں فی الحقیقت تو اس کی بیوی نہیں تھی، لیکن جب آپ نے فیصلہ دے ہی دیا تو اب میرا اس مرد سے نکاح بھی کرا دیجیے تاکہ میں اس پر حلال ہو جاؤں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا زوجاك شاهداك (تیرے خلاف دو شہادتوں نے تو اب تیرا نکاح اس مرد سے گویا کر ہی دیا ہے۔ اب تزویج کی حاجت باقی نہیں رہی)۔ اس مقدمے میں حضرت علیؓ کے قول و فعل نے یہ ثابت کر دیا کہ عدالت کا فیصلہ ظاہر و باطن میں نافذ ہو جاتا ہے۔ اسی سے امام صاحب کے الفاظ ظاہراً و باطناً کے صحیح معنی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بہر حال اس بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عائد کردہ معارضات غلط فہمی پر مبنی ہیں، ورنہ اگر غور و تامل سے کام لیا جائے تو امام صاحب کی دقتِ نظر اور ان کے فہم و فراست کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

غلام علی

مطبوعات

تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اوّل اور دوم | تالیف مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی ناشر: دار المصنفین اعظم گڑھ (بھارت) صفحات حصہ اول ۳۲۱ قیمت -/۶ روپے، حصہ دوم ۳۸۹ قیمت ۶/۸ روپے۔

اس بیش قیمت تصنیف کے مصنف مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی شخصیت کسی طرح بھی محتاج تعارف نہیں۔ ان کی علمی اور دعوتی سرگرمیوں سے نہ صرف پوری دنیائے اسلام آشنا ہے بلکہ ان کی معترف بھی ہے۔ وہ ایک جید عالم اور عربی اور اردو کے بہترین انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ بصیرتِ مومن اور دلِ بیتاب بھی رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات جہاں معلومات کے اعتبار سے بلند اور وقیع ہیں، وہاں مسلمانوں کے اندر پھیلے ہوئے بہت سے فتنوں کی بھی بیخ کنی کرتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان حقائق کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ اس میں اگر ایک طرف عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور یگانہ اصحابِ دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، اُن کے علمی و عملی کارناموں کی روداد اور اُن کے اثرات و نتائج کا تذکرہ ہے تو دوسری طرف اس میں ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہے جو مسلمانوں میں تاریخِ اسلام اور فلسفۂ تاریخِ اسلام کے بارے میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔

مغرب کے فکری اور علمی اثرات نے ہمارے اندر جس قسم کا تاریخی ذوق پیدا کیا ہے وہ بڑا غلط اور دینی نقطۂ نظر سے بالکل بیکار ہے۔ ایک مسلمان جب اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر رفقائے کار کے بعد امتِ مسلمہ کی پوری تاریخ محض ایک خلا یا لق و دق صحرا ہے جس میں کہیں ایک دوسرے سے بہت دور انسانی عظمت کے کچھ نشانات پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب نے اس غلط تاثر کو جو دانائے فرنگ نے بعض مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ذہنوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، کافی حد تک دُور کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ایک مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے سے وابستہ ہے۔ اس میں کوئی خلا نہیں۔ اس امت پر کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جس میں اسلام کی حفاظت یا

تجدید و تقویت کی خدمت انجام نہ دی گئی ہو، جس میں غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سد باب نہ کیا گیا ہو اور اسلام کے فکری اور عملی ذخیرہ میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ ہوا ہو۔ اس تالیف سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اصل خلا اسلام کے سلسلۂ دعوت و اصلاح میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کی ترتیب میں ہے۔

ایک مسلمان جس تاریخ سے عام طور پر واقف ہے اُس کا انداز بڑا ہی عجیب و غریب ہے سب سے پہلے سرورِ دو عالم اور اُن کے عظیم المرتبت ساتھیوں کی زندگیاں اور ان کے کارنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس دور کے بارے میں مسلمانوں کے ذہن میں کوئی زیادہ الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ یہ مقدس ہستیاں اُمّت مسلمہ کی ایک بہت بڑی اکثریت کی نظر میں ایسی ہیں جن کی عظمت کے نہ صرف مسلمانوں کے دماغ قائل ہیں، بلکہ جن کی محبت سے اُن کے دل بھی معمور ہیں۔ مگر ان بزرگ و برتر شخصیتوں کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہماری تاریخ کا محور و مرکز وہ حضرات بنتے ہیں جو یا تو بادشاہ تھے یا بادشاہ گر۔ ان حضرات میں بہت تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی شمشیر زنی، وجاہت، قوت و اختیار کو تو بلاشبہ ایک دنیا مانتی اور تسلیم کرتی ہے مگر مسلمانوں کے دلوں میں اُن کا وہ عزت و احترام نہیں جو ایک قوم کے دل میں اسلاف کا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مستقل افکار کا حامل ہے، اُس کا ایک مخصوص اسلوبِ حیات ہے، اس کا ایک الگ نصب العین ہے۔ وہ زندگی کے سارے واقعات و حوادث کو، وہ اس دنیا کی چھوٹی بڑی ، تمام شخصیوں کو وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر اُس کے لیے یہ چیز قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کوئی شخص بوریا نشین ہے یا بادشاہ۔ اُس کی محبت اور عقیدت کا معیار صرف ایک ہے ــــ کوئی شخص کس حد تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تبع اور فرمانبردار ہے۔ اور جو شخص بھی جس نسبت سے اس معیار پر پورا اترتا ہو اُس کی دنیاوی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو ــــ وہ اس کے نزدیک اسی تناسب سے محبت اور احترام کے لائق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے بادشاہوں کی بجائے "فقیروں" سے محبت کی ہے۔ دربار و ایوان میں رہنے والوں کی بجائے اُن لوگوں کا احترام کیا ہے جو جھونپڑوں اور خانقاہوں میں رہتے تھے۔ اس کتاب

کو پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مسلمانوں کے لیے یہ چیز سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی کہ کسی شخص کا دنیاوی مرتبہ اور مقام کیا ہے۔ اُس کے لیے ایک ہی ترازو ہے اور ایک ہی پیمانہ، اور وہ ہے اسلام۔ اور اسی کے مطابق وہ ہر شخص کو تولتا اور اس کے اعمال کو جانچتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے ہمیں آسانی سے پتہ چل سکتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف مصلحین نے حالات و واقعات کے پیشِ نظر اسلام کی مدافعت اور ترقی کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ کہاں تک مفید اور کارآمد ثابت ہوئے۔ ان سے ہم بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

تبصرہ نگار کا ہمیشہ سے ہی یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو ازسرِنو مرتب کرنا چاہیے اور خالص اسلامی نقطۂ نظر سے افراد اور واقعات کا جائزہ لینا چاہیے۔ مقامِ شکر ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب نے اس طرف ایک ایسا عملی قدم اٹھایا ہے جو نہ صرف نہایت مفید ہے بلکہ مستقبل میں کام کرنے والوں کے لیے ایک نشانِ راہ یا سنگِ میل کا کام دے سکتا ہے۔ تبصرہ نگار جب اس کتاب کو ختم کر چکا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ ایک بہت بڑے آفتاب نے چند شمعیں فروزاں کیں جو اپنی تابناکی میں بے مثال تھیں۔ ان شمعوں سے پھر دوسرے چراغ روشن ہوئے اور یہ چراغ انسانیت کی لمبی شاہراہ پر آج تک جگمگا رہے ہیں، ان چراغوں کے گو مختلف رنگ ہیں مگر ان سب نے ایک ہی آفتاب سے نور حاصل کیا ہے۔ ان کی ضیا پاشیاں بڑی خاموشی سے اس بات کا اعلان کر رہی ہیں ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

کتاب کی پہلی جلد میں پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک کی رودادِ اصلاح و دعوت درج ہے۔ شخصیتوں کے اعتبار سے سیدنا عمر بن عبدالعزیز سے لے کر مولانا جلال الدین رومی تک اصحابِ دعوت و عزیمت کا تعارف اور اُن کے مصلحانہ و اولوالعزمانہ کارناموں کی تفصیل آگئی ہے۔ دوسری جلد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی سوانح حیات اور اُن کے تلامذہ اور اُن کے دبستانِ فکر کے

فضلا کا تذکرہ ہے۔ خدا کرے کہ مولانا اس سلسلہ کی باقی جلدیں لکھ کر اس مفید کام کی جلد از جلد تکمیل کریں آخر میں اشاریہ (INDEX) اسماء و کتب بہ ترتیب حروفِ تہجی نے اس کتاب کو بہت زیادہ مفید بنا دیا ہے۔ (ع - ح)

رگِ جاں از عاصی کرنالی۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور۔ عاصی کرنالی کی نظموں اور غزلوں کا یہ مجموعہ مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے تعارف اور جناب ماہر القادری صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ مکتبہ تعمیر انسانیت نے شائع کیا ہے۔ عاصی صاحب ہمارے حلقۂ ادب کے اُن چند شعراء میں سے ہیں جو گذشتہ دس بارہ سال سے نئی نسلوں کے لیے پاکیزہ شعری و ادبی فضا تیار کرنے میں پیش پیش ہیں اور جن کے کلام میں مقصدیت کے ساتھ شعریت اور پختگی بھی کافی حد تک پائی جاتی ہے۔

اس مجموعہ میں کئی نظمیں شعری حسن اور پاکیزہ احساسات و جذبات کے اچھے نمونے ہیں۔ تبصرہ نگار کا عام تاثر یہ ہے کہ چھوٹی نظمیں کامیاب ہیں لیکن طویل نظموں میں جا بجا فکری لغزشیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے طویل نظم لال قلعہ لیجیے جو پورے سات صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں اُن میں بعض "شمشیر و سناں" کے دور سے وابستہ ہیں اور بیشتر "طاؤس و رباب" کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس صدی کے اوائل تک ہم ان آثارِ قدیمہ کو ملی جذبہ (یا صحیح الفاظ میں جذبہ اسلاف پرستی) کے تحت یکساں عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ لیکن جوں جوں اسلامی اقدار کا شعور پیدا ہوتا گیا ہمارا زاویۂ نظر بھی بدلتا رہا۔ تعجب ہے کہ عاصی صاحب کی اس نظم میں اور آج سے نصف صدی پہلے کی اسی قبیل کی نظموں (مثلاً اسمٰعیل میرٹھی کی مشہور نظم قلعہ اکبر آباد) میں بلحاظ نقطۂ نظر کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح کی فکری بے اعتدالی اور عدمِ مناسبت کی مثال ہمیں "ترمیم"، "سوداگر" وغیرہ میں ملتی ہے۔

زیرِ تبصرہ مجموعہ میں دورِ اول کی غزلیں جو زہر و تریاق کے عنوان سے مرتب کی گئی ہیں، شعریت، تغزل، روانی اور ترنم کے اعتبار سے دورِ ثانی کی غزلوں سے زیادہ جاندار ہیں۔ ان میں مجاز کی رنگینیوں کے باوجود جذبات کی پاکیزگی اور تخیل کی لطافت و نفاست جلوہ گر ہے۔ کتاب کا معیارِ طباعت عمدہ ہے۔

(ا - ا - ص)

للکار | نتیجۂ فکر یعقوب طاہر صاحب۔ قیمت ۸/۱، صفحات ۱۴۴ ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ لاہور۔

اسلام پسند شعراء میں یعقوب صاحب کافی معروف ہیں۔ اور ان کے کلام کو کافی حد تک پسند کیا جاتا ہے۔ یعقوب صاحب کی شاعری مقصدی شاعری ہے اس لیے چند حدود و شرائط کی پابند ہے۔ اس پابندی کی وجہ سے ان کے کلام میں سنجیدگی اور وزن پیدا ہو گیا ہے۔ وہ چونکہ راہِ حق کے ایک فرض شناس سپاہی ہیں اس لیے اکثر و بیشتر ان کے کلام میں رجز کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ حساس دل رکھتے ہیں اس لیے معاشرے کی ذرا سی خرابی اور بے راہ روی سے تلملا اٹھتے ہیں اور اس تلملاہٹ کا اظہار پورے خلوص کے ساتھ اشعار میں کر دیتے ہیں، اسی وجہ سے تفکر کا ٹھہراؤ آپ کے کلام میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ غالباً جذبات کی شدت میں کمی ہو گی تو حکمت کا اثر ذہن میں کارفرما ہو جائے گا اور پھر حکمت و جذبات کے امتزاج سے ایک زیادہ متوازن اور فن کلام پیدا ہو گا جس میں انسانی زندگی کے حقائق کا اظہار اور جذباتی رنگینی کا رچاؤ اپنی اپنی مناسبت سے جلوہ گر ہو جائیں گے۔

شروع میں یعقوب صاحب صرف نظم لکھتے تھے لیکن اب وہ ایک سال سے غزل کا تجربہ کر رہے ہیں اور شاید اس تجربے میں انھیں نظم سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ غزل کی ایمائیت۔ داخلیت اور جذباتی رچاؤ کے عناصر سے اپنی چند غزلوں میں کام لینے کی کوشش کی ہے جو خاصی کامیاب معلوم ہوتی ہے۔ غرضیکہ فنی ارتقاء کے لیے ابھی یعقوب صاحب کو بہت کچھ کرنا ہے۔ زبان کی لطافت اور استادانہ قدرت کی منزل تک پہنچنے کے لیے بھی کئی منزلوں سے گزرنا پڑے گا۔ کتاب کی طباعت اور کتابت ناقص ہے۔

(ا۔ ا۔ س)

ماہنامہ ہماری دنیا | زیرِ ادارت طاہر رسول صاحب، محبوب ربانی صاحب اور عزیز الرحمٰن صاحب۔ قیمت فی پرچہ چھ آنے۔

والدین کو جہاں ننھے بچوں کی جسمانی نشو و نما کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہاں اُن کی ذہنی تربیت بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس عہد میں احساسات کے جو بیج قلوب میں ڈال دیئے جاتے ہیں وہ وقت کے

گزرنے کے ساتھ ساتھ سیرت و اخلاق کے سایہ دار درختوں کی شکل میں برومند ہوتے ہیں۔ اس لیے نفسیات کے ماہرین نے اس عہد کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ لیکن یہ کام بہت کٹھن اور مشکل ہے۔ اس عہد کے لیے کوئی مفید اور اچھا لٹریچر پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ زیرِ نظر رسالہ اسی قسم کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات، معلوماتِ عامہ کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ بچوں کے ذہنوں میں کوئی خلا پیدا نہ ہونے پائے۔ وہ دین و دنیا کو حیاتِ انسانی کے دو علیحدہ علیحدہ خانے نہ سمجھیں بلکہ اُسے ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھیں۔
ہم اس کتابچے کے پڑھنے کی بچوں سے سفارش کرتے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

نظر آتا ہو

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ماضی میں بے شمار بندگانِ خدا ایسے گزرے ہیں جو دنیاداری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز تھے۔ اُن کی حیثیت بحرِ ظلمات میں روشنی کے مینار کی سی تھی جہاں لوگ پروانہ وار گرتے اور نورِ ہدایت حاصل کرتے۔ مگر اس کا کیا علاج کیا جائے کہ آج کل حکومت اپنی لامحدود قوت و طاقت سے شر اور فساد کی جو خطرناک آندھیاں چلاتی ہے، اور گمراہی اور ضلالت کی جو تند و تیز موجیں خدا ناشناسی اور جاہلیت کے سمندروں سے اٹھائی جاتی ہیں وہ اول تو ان میناروں کو ہی مسمار کر دیتی ہیں، اور اگر وہ باقی رہ بھی جائیں تو یہ چند منفرد لائٹ ہاؤس کسی طرح بھی اتنی روشنی نہیں پھینک سکتے جو جدید زمانے کی حکومت کے اٹھائے ہوئے ہمہ گیر طوفانِ ظلمت کا مقابلہ کر سکے۔ اس پر مزید یہ کہ کفر و فسق کی حکومت جہاں بھی کام کر رہی ہے وہاں اس طرح کے انفرادی میناروں کی پیدائش اور ان کے ابھرنے کے امکانات وہ روز بروز بڑی تیزی کے ساتھ ختم کرتی چلی جا رہی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد ایک ہزار سال کی مدت میں بھی سیاسی نظام کے بگاڑ نے اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کو وہ نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا کہ گذشتہ سو سال کے اندر غیر اسلامی تسلط نے پہنچا دیا ہے۔ اس زمانہ میں سیاسی نظام نہ اتنا ہمہ گیر تھا، نہ اتنا طاقتور اور مضبوط تھا، اور نہ اس کے پاس ایسے زبردست ذرائع و وسائل تھے کہ جدید زمانے کی ریاست سے اس کو کچھ بھی نسبت ہو۔ اس بنا پر معتقدات و افکار کی دنیا اور اخلاق و تہذیب اور تمدن و معاشرت کے دائرہ تک سیاسی تبدیلیوں اور سلاطین و امراء کی بگڑی ہوئی روش کے اثرات پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور اور ضعیف ہو جاتے تھے کہ ان سے اسلامی اقدار اور طرزِ زندگی کو کوئی بہت بڑا خطرہ لاحق نہ ہو سکتا تھا۔ پھر حکومت کے متوازی دوسری طاقتیں بھی موجود تھیں اور انہیں کام کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔ آزاد نظامِ تعلیم، آزاد مدارس، آزاد تربیتی ادارے، آزاد نظامِ معاشرت اور آزاد معیشت مل جل کر اتنا کافی زور رکھتے تھے کہ کبھی کوئی بڑی سے بڑی بگڑی ہوئی حکومت بھی پورے نظام کو بگاڑ دینے پر قادر نہ ہو سکتی تھی۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ جس آن کوئی برائی اقتدار کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اسی آن وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ معاشرت و معیشت سے لے کر تعلیم و تربیت اور خاندانی زندگی کے نظام تک اُس کے زہریلے اثرات پھیل جاتے ہیں۔ پھر زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں رہتا جس پر اس کے نقوش نہایت واضح اور گہرے نہ ہوں۔ ریڈیو، سینما، صحافت، مدارس، یونیورسٹیاں سب پر فسق کا پورا پورا قبضہ ہوتا ہے۔ فاسق ریاست جو عقائد و تخیلات، جو معتقدات و نظریات، جو افکار و احساسات لوگوں میں پھیلانا چاہتی ہے، بغیر کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی تشدد کے اپنے وسائلِ نشر و تبلیغ اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ پھیلا دیتی ہے۔ نظری حیثیت سے لوگ اس معاملہ میں آزاد ہوتے ہیں کہ وہ جس دین کو چاہیں اپنالیں، جس نظریۂ حیات کی پیروی کرنا چاہیں، کریں، جس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، کرلیں، لیکن عملی حیثیت سے یہ آزادی محض حکایتِ تشنہ و سراب ہے۔ اسٹیٹ کی قوتِ قاہرہ عوام پر پوری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ بالکل دھیمے دھیمے غیر محسوس طور پر بڑی حکمتِ عملی کے ساتھ افراد کو جس سانچے میں چاہتی ہے ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد حالات جس سرعت سے بدل رہے ہیں وہ ہر ہوشمند انسان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن دیکھیے، کیا فسق و فجور کو فروغ دینے میں کسی پر جبر و تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی نشر و اشاعت تو کبھی آرٹ اور ادب کے نام پر، کبھی دیہاتی فلاح و بہبود کے نام پر، کبھی قومی عزت و ناموس کے نام پر، کبھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نام پر نہایت خوبی سے کی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ریڈیو سے لوگوں کا دل بہلا دیا جاتا ہے، کچھ فلموں کو سنسر کرنے میں ذرا سی چشم پوشی سے کام لے لیا جاتا ہے، کچھ مخلوط تعلیم کے ذریعہ سے قوم کی تعلیمی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور کچھ بڑھتی ہوئی آبادی کے مرض کا مداوا برتھ کنٹرول کے پروپیگنڈا سے کر دیا جاتا ہے۔ اتنی ذرا سی تدبیروں کا نتیجہ یہ ہے کہ اصحابِ اقتدار کے فاسقانہ عزائم کی فوج ظفر موج میدان پر میدان فتح کرتی چلی جاتی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہر روز وہ کتنے نئے خاندانوں اور افراد کو خراب کر دیتی ہے۔ اس فوج نے ہمارے عائلی نظام کے قلعہ میں رخنے پیدا کیے مگر ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ اور اب جب دشمن پوری طرح اندر گھس آیا ہے تو ہم بھی اتنے بدل چکے ہیں کہ اسے اپنے حق میں فالِ نیک خیال کر رہے ہیں۔ اس فوج کے مختلف دستے زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیل کر اپنا کام پوری تندہی سے کر رہے ہیں اور ہم ایک بے بس اور مجبور انسان کی طرح ان کی ریشہ دوانیوں کا تماشہ دیکھتے جارہے ہیں۔ انھوں نے ہماری دینی حس اور حمیت کو اب اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہمارے اندر اس کے خلاف نفرت کی کوئی معمولی سی تحریک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ اپنی ذات میں خواہ کتنے ہی نیک اور پاکباز ہوں لیکن اس مسموم فضا کو کیا کریں گے جو آپ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ مدرسہ میں، اخبارات میں، ریڈیو پر غرض ہر جگہ آپ کے کانوں میں وہی باتیں پڑیں گی جن کی ریاست ترویج و اشاعت کرنا چاہتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ پہلے ایک مدت صرف افراد بنانے میں صرف کرنی چاہیے، پھر ایک اور مدت صرف معاشرے کی اصلاح میں صرف ہونی چاہیے، پھر آخر کار اس انفرادی تیاری اور اجتماعی اصلاح کے نتیجے میں یا تو ریاست آپ سے آپ بدل جائے گی، یا نہیں تو وہ حملہ آور ہو کر ریاست کو بدل ڈالے گا، تو دراصل ایسا شخص اپنے خیالات ہی کی بنائی ہوئی دنیا میں رہتا ہے، واقعات کی دنیا سے اس کو کوئی

تعلق نہیں ہے۔ واقعات کی دنیا میں رہنے والا جانتا ہے کہ ہمہ گیر ریاست میں انقلاب ایک جوابی ہمہ گیر تحریک کے بغیر نہیں آسکتا۔ ریاست کے تسلط میں جہاں غنیمت رخنہ بھی پایا جائے اس کے اندر فوراً آگے بڑھ کر در آنے کے لیے جو تحریک تیار نہ ہو اور خود ریاست پر تسلط حاصل کرنے کا جو موقع بھی مل جائے اسے استعمال کرنے سے جو تحریک جی چراتی ہو اس کا یہ کہنا کہ ہم نظام زندگی میں انقلاب چاہتے ہیں، یا تو علم کا افلاس ہے یا عقل کا افلاس۔ اس طرح کی باتیں سوچنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ جدید ریاست افراد کی تیاری اور معاشرے کی اصلاح کے مواقع کس رفتار سے کم کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اٹھنے والے اگر اس کے تسلط کو گھٹانے اور اس کے خلاف اصلاح طلب قوتوں کو آگے بڑھانے کا کوئی موقع پاتے ہوں اور پھر جان بوجھ کر اس کو اس لیے چھوڑ دیں کہ انہیں پہلے افراد اور معاشرہ تیار کرنا ہے، تو لامحالہ اسے نادانی ہی سمجھا جائے گا۔

مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی میں مملکت اور ریاست کی اہمیت کا احساس کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ تصور ان میں بالکل ابتدا ہی سے پایا جاتا رہا ہے کہ انسانیت کی فلاح اس میں ہے کہ دین و دنیا اور اخلاق و سیاست ساتھ ساتھ رہیں۔ یہی تصور مختلف اوقات میں مختلف تحریکات کی شکل میں ملتِ اسلام میں جلوہ گر ہوا ہے۔ دُور نہ جائیے اور صرف یہ دیکھیے کہ یہ ملک پاکستان کس تخیل کی کرشمہ سازی ہے؟ پاکستان کے مطالبے میں جو چیز مسلمانوں کے لیے وجہ کشش تھی وہ آخر اس کے سوا کیا تھی کہ ان کا دین اُن اجتماعی تخیلات اور معاشرتی افکار کو قبول کرنے میں مانع تھا جن پر ہندوستان کی انگریزی حکومت قائم تھی اور آئندہ کانگریس کی تجویز کردہ سیکولر ریاست قائم ہونے والی تھی۔ مسلمان اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے کہ بنیادی حقوق کی یقین دہانیاں، اور مذہب و کلچر کی آزادی کے وعدے اس دَور کی جمہوری لادینی حکومت میں اس قدر بے معنی ہیں کہ ان کے سہارے اسلامی تہذیب کو ہندوستان میں زندہ نہ رکھا جا سکے گا۔ ریاست کی ہمہ گیری اور اس کی قوت آہستہ آہستہ سب لوگوں پر اپنے مخصوص تصورات پوری طرح مسلط کر دیگی۔ اس کے مقابلے میں یہ امید رکھنا کہ ہم ان اثرات سے

اپنے آپ کو بچا کر رکھ سکیں گے محض واہمہ ہے۔ مسلمانوں کو انگریزی دور کا طویل تجربہ یہ بتا چکا تھا کہ اس زمانے کی ہمہ گیر ریاست زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مذہب کو مطلق العنان اور خود مختار نہیں چھوڑتی۔ انہی وجوہ سے جب مسلمانوں کے سامنے ان کی اپنی ایک آزاد مملکت کا تخیل پیش کیا گیا تو انہوں نے لبیک کہہ کر اسے قبول کر لیا۔ انہوں نے ایک ایسی مملکت کے قیام کو اپنے دین کا تقاضا سمجھا جہاں مملکت اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل کو دینِ حق کے قیام پر صرف کیا جائے اور جہاں ریاست مسلمانوں کے تخیلات میں صرف مزاحم ہی نہ ہو، بلکہ اسلامی نظریات و افکار کی توسیع و اشاعت اپنا فرضِ منصبی سمجھے اور اپنے اثر سے ان تمام احکام کو نافذ کرے جن کا حق تعالیٰ ملتِ اسلامیہ سے مطالبہ کرتا ہے۔

مملکت اور ریاست کو حلقہ بگوشِ اسلام بنانے کی ضرورت اب دنیا کے دوسرے مسلم ممالک میں بھی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اب پوری طرح احساس ہو چکا ہے کہ اگر وہ کوئی ہمہ گیر انقلاب لانا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ اقتدار کی باگیں فساق و فجار سے چھین کر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں دیں جو اس کو خیر اور بھلائی کے لیے استعمال کر سکتے ہوں اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ وہ قوت و طاقت سے اُن برائیوں کو روکیں گے جنہیں اسلام دنیا سے مٹانا چاہتا ہے۔

بعض حلقوں میں یہ اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے کہ مذہب کو ملکی اقتدار اور دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔ اس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی خواہش اور آرزو دنیوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف اور جداگانہ چیز ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز ہی سمجھ کر اُن پر حکم لگا دینا صحیح نہیں۔ جو لوگ اپنے شخصی یا خاندانی یا قومی اقتدار کے لیے کوشش کرتے ہیں اُن کی حیثیت بالکل جدا ہوتی ہے اور یہ چیز اسلامی نقطۂ نظر سے بہت بُری ہے۔ یہ وہ جاہلیت ہے جس سے بچنے کے لیے مسلمان کو اپنے اللہ سے ہمیشہ پناہ مانگنی چاہیے۔ لیکن جس اقتدار سے مقصود یہ ہو کہ کفر کا غلبہ مٹے اور

خدا کی زمین میں اس کے دین کا بول بالا ہو اس کو دنیاداری سمجھنا سخت غلطی ہے ۔کوئی دنیوی کام جو جذبۂ دینی کے تحت اسلامی نصب العین کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کیا جائے گا وہ دینی کام ہی ہوتا ہے ۔اسلام میں دین اور دنیا کے ڈانڈے ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی ۔یہاں اصل معاملہ نیت اور ارادہ کا ہے ۔ایک کام جو ہمیں بظاہر دنیاداری نظر آتا ہے، خالص دینی کام ہو سکتا ہے اور دوسرا کام جس میں ہم سراسر روحانیت دیکھتے ہوں حقیقۃً دنیاداری بن کر رہ جاتا ہے ۔مسلمان کا ہر دنیوی عمل روحانی عمل ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے اخلاقی اقدار و غایات کا تابع ہو ۔اور اُس کا ہر روحانی اور مذہبی کام بھی دنیاداری ہے جس میں مالک کی رضا جوئی شامل نہ ہو ۔

خریدارانِ ترجمان القرآن سے

التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف خوشخط لکھیئے (خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے) سابق نمبر خریداری بھی۔

۲۔ تبدیلیٔ پتہ کی فرمائش مہینہ کی پندرہ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیے جس میں پہلا اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں۔

۳۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجیے یا وی۔پی کی اجازت دیجیے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظرانداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

منیجر

خـــالی صفحـــه

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی ۔ اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے ۔ کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے ۔ تقسیم ہند سے قبل حالات کیا تھے ۔ ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا ۔ تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے ۔ ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اس نے اسے کس حد تک انجام دیا ۔ پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے ۔

قیمت ۲-۱۲-۰ روپے

تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا ’’تزکیہ‘‘ کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا ’’تزکیہ‘‘ کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۳-۸-۰ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان ۔ اچھرہ ۔ لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ۔ مسلم مسجد